فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	بعثتِ نبویؐ	پروفیسر محمد اکرم طاہر	8
قولِ نبیؐ	تزکیہ کرنے والے نبیؐ (حصہ دوم)	ڈاکٹر آسیہ شبیر	12
خاص مضمون	ہم کیا پی رہے ہیں؟	ڈاکٹر ام کلثوم	16
نوائے شوق	محسنِ بنتِ حوا	شمیم فاطمہ	22
	سنا ہے غم میں طاقت ہے!	روبینہ فرید	23
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	24
	غزل	صہیب اکرام	24
	ماں	حافظ کرناٹکی	25
حقیقت وافسانہ	مہذب	قانتہ رابعہ	26
	من کا پاپ	افشاں نوید	28
	قطرہ قطرہ شبنم	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	30
انتخاب	اولڈ ایج ہوم	میرزا ادیب	34
سلسلہ وار کہانی	شکست کے رتھ پر سوار	نصرت یوسف	44
نامور خواتین کا تذکرہ	ام المؤمنین حضرت صفیہ بنت حُیّیؓ	حمیرا خالد	49
ہلکا پھلکا	اختلاف کے باوجود	شمیم فاطمہ	51
	وفا کی پیکر	رخسانہ اقبال راؤ	53
خفتگانِ خاک	آسماں تیری لحد پہ......	قانتہ رابعہ	56
ملاقات	مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری	آسیہ راشد	66
غذا وصحت	حجامہ، ایک مسنون اور مؤثر طریقۂ علاج	فریدہ خالد	71
	تمباکو نوشی سراسر ابتاہی ہے	طوبیٰ طارق	73
گوشۂ تسنیم	رب کی سرگوشی	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	74
بتول میگزین	نزہت ظفر، رافعہ صلاح الدین، فاطمہ عامر		76
منتخب کالم	ہمارے معاشرتی رویے	اسرار احمد کسانہ، جمشید چشتی	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! شبِ معراج کی مبارک گھڑیوں میں یہ سطور لکھ رہی ہوں۔ مسجدوں سے ذکر بلند ہو رہا ہے اور گھروں کی خلوتیں عبادت سے پُرنور ہیں۔ یہ گھڑیاں خود بھی مبارک ہیں اور ماہِ مبارک کی قربت کا بھی احساس دلاتی ہیں۔ اللہ کرے آپ سب اپنے متعلقین سمیت بخیریت ہوں اور کارخانۂ حیات میں سرگرم۔ نعت کے باکمال شاعر اقبال عظیم کے دو شعر:

میں تو خود اُنؐ کے در کا گدا ہوں، اپنے آقا کو میں نذر کیا دوں
اب تو آنکھوں میں بھی کچھ نہیں ہے، ورنہ قدموں میں آنکھیں بچھا دوں
میرے آنسو بہت قیمتی ہیں، ان سے وابستہ ہیں اُن کی یادیں
اِن کی منزل ہے خاکِ مدینہ، یہ گہر یونہی کیسے لُٹا دوں

تیرہ چودہ برس پہلے پاکستان میں کیبل نشریات کے آغاز کو خوش آئند سمجھا گیا تھا۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع اپنی وسیع پہنچ کے باعث بے حد طاقتور ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعے کوئی بھی پیغام لوگوں تک فوری، موثر اور لامحدود رسائی رکھتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت اس بات میں یقین رکھتی ہے کہ ذرائع غلط نہیں ہوتے بلکہ اچھائی یا برائی پیغام میں ہوتی ہے۔ اور اسی بنا پر معاشرے کے ہر طبقے نے بیشمار چینلز کھل جانے کی صورتحال کو مثبت نظر سے ہی دیکھا، دینی چینل بھی کھلے، اور عام چینلز پر ہونے والی دینی وسیاسی بحثوں میں علمائے کرام بھی برضا و رغبت شریک ہونے لگے۔ مگر گزشتہ برسوں میں یہ تکلیف دہ صورتحال سامنے آئی کہ ہمارے ہاں میڈیا خیالات ونظریات کی وہ کھلی منڈی نہیں ہے جس کے بارے میں ابلاغِ عامہ کے نظریہ دانوں نے فرض کرلیا تھا کہ ایسی صورت میں حق اور سچ خود بخود واضح ہو جائے گا اور حق نکھر کر ابھر آئے گا، بلکہ یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ حق اور باطل، سچ اور جھوٹ کے اس کھیل کو وہ ''مارکیٹ فورسز'' کنٹرول کرتی ہیں جو کمرشل ازم کی مرہونِ منت ہیں اور جو کمرشل ازم سرمایہ دارانہ معیشت کی حالیہ بدترین شکل کی کوکھ سے پھوٹ رہا ہے، جو منفعت کے سوا کسی اصول اور قانون کا پابند نہیں اور جس کے لیے انسانی

معاشرے محض مصنوعات کی منڈیاں ہیں۔ ان منڈیوں کو بڑھاوا دینے کے لیے ضروری ٹھہرا کہ جو تہذیب، مذہب، قانون، رواج، چلن یا مائنڈ سیٹ اس کی راہ میں رکاوٹ بنے اس کو روند ڈالا جائے اور اس کی دھجیاں اڑا دی جائیں۔

بدقسمتی سے گزشتہ کئی برسوں سے ہم ان ہی حالات میں جی رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا پر پروگراموں کی ریٹنگ بڑھانے اور اس کے نتیجے میں بڑی بڑی کمپنیوں سے زیادہ سے زیادہ اشتہار حاصل کرنے کے لیے ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کہنے کو پیمرا نام کا ایک ادارہ موجود ہے، قانون اور ضابطے بھی بنے ہوئے ہیں جن کے مطابق وہ نشریات کو منضبط کرنے کا مجاز اور پابند ہے، مگر عملی طور پر پاکستان کے اکثریتی چینل دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس قوم کا نہ تو کوئی دین ہے، نہ اخلاقیات اور نہ ہی کلچر۔ اور جو کلچر پیش کیا جا رہا ہے وہ بھارتی اور مغربی کلچر کا ایک مکروہ سا ملغوبہ ہے جس میں نہ لباس کی کوئی تمیز ہے نہ زبان و بیان کی، نہ مرد و عورت کی نہ بڑے چھوٹے کی۔ مصنوعات بیچنے کے لیے ایسی ایسی ''تخلیقی'' تھیم نکالی جاتی ہیں کہ پراڈکٹ مشتہر ہو جائے، بھلے شرفا کی آنکھیں نہ اُٹھ سکیں، گھر والوں کے ساتھ بیٹھنا محال ہو جائے۔ عشاریہ چند فیصد لوگوں کے رہن سہن اور اقدار کو یوں ہر ڈرامے، ہر مارننگ شو میں دکھایا جاتا ہے گویا یہی اس ملک میں رہنے والوں کا طرزِ حیات اور تفکرات اور جدوجہد کا مرکز و محور ہے۔ فاحشہ عورتوں اور ناچنے گانے والے طبقے کو نوجوان نسل کے لیے رول ماڈل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

مارننگ شوز کی کہانی بھی عجب ہے۔ چند چینلز نے ایک سے بڑھ کر ایک رکیک اور مبتذل شو پیش کرنے میں مقابلہ لگا رکھا تھا۔ حالانکہ آٹے میں نمک کے برابر سہی، چند معیاری مارننگ شو بھی موجود ہیں جو ریٹنگ کی نحوست کے اس حد تک شکار نہیں کہ تہذیب و اخلاق کو قربان کر دیں۔ مگر کمرشل ازم کے آستانے پر سر جھکانے والوں کی اصلیت سامنے آ کر رہی۔ خیال تو یہ تھا کہ پہلے ریاستی اداروں اور اب دینی شعائر کی بے حرمتی کرنے پر جیو کے خلاف جو سخت ردعمل سامنے آ رہا ہے، اس کے نتیجے میں کچھ اصول ضابطے بنیں گے، میڈیا کی اس مادر پدر آزاد روش پر بھی گرفت ہو گی جس کا سرخیل ہونے کا شرف جیو گروپ کو حاصل تھا اور کئی سروے کے مطابق جس سے پاکستان کے اکثریتی عوام سخت نالاں ہیں، عدالتِ عالیہ اور ہائی کورٹ دونوں میں جس کے خلاف اپیل دائر کی گئی ہے اور مقدمہ چل رہا ہے،

اور معتبر صحافیوں دانشوروں کی جانب سے جس پر بیشمار کالم اور مضامین شائع ہو چکے ہیں، عوام کے سنجیدہ حلقوں کی جانب سے مسلسل مذمت کی گئی ہے، عوامی شکایات کا ایک انبار ہے جو پیمرا کی ویب سائٹ اور متعلقہ چینل مالکان کو بذریعہ فون کالز، خطوط اور ای میل موصول ہوتا ہے۔ مگر وہی ہوا جو گزشتہ کئی برسوں سے ہم یہاں ہوتا دیکھ رہے ہیں یعنی زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ پیمرا کے سرکاری ارکان کے طفیل جیو نہ صرف صاف بچ نکلا بلکہ اپنی مظلومیت کی داستانیں سنا کر ہیرو بنا چاہتا ہے۔ اصل مظلوم، میڈیا کی فرعونیت کے شکار پاکستان کے عوام وہیں کے وہیں رہے۔ مکمل حکومتی سرپرستی میں پنپنے والے، اور کھلے جرائم کے باوجود حکومتی آشیرباد سے سزا سے بچ جانے والے چینل کی طرف سے ''جبر اور دباؤ'' کے مقابلے کے دعوے مضحکہ خیز ہیں۔

اگر اس تمام کارروائی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا تو یہ سوچنا فطری ہے کہ شاید یہ سارا ہنگامہ بھی عوام کی توجہ سنگین ملکی معاملات اور حکومت کی ناقص کارکردگی سے ہٹانے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ اپوزیشن جماعتوں کی حکومت مخالف ریلیوں اور خصوصاً تحریکِ انصاف کی جانب سے انتخابی دھاندلیوں اور ان میں جنگ گروپ کے ملوث ہونے کے خلاف زور پکڑتی ہوئی تحریک اور مڈٹرم الیکشن کے مطالبے نے حکومت کے لیے خاصی پریشانی کھڑی کر رکھی ہے۔ لوڈ شیڈنگ سے جزوی نجات کی بھی کوئی صورت حکومت سے بن نہیں آئی۔ بیرونی قرضوں کا بوجھ کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ ایسے میں اس ایک تیر سے دو تین شکار بآسانی کیے جا سکتے تھے۔

اس قصے میں سب سے زیادہ پیمرا کا کردار سوالات کی زد میں آتا ہے کہ جب قابلِ اعتراض مواد چلا تو پیمرا نے اسے آن ایئر کیوں جانے دیا۔ عوام یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسے ادارے کی کوئی افادیت ہے بھی یا نہیں جس کی چوکسی اور حساسیت کا یہ عالم ہے کہ قابلِ اعتراض مواد کئی گھنٹے تک چلا اور ادارہ سویا رہا۔ نیز جب اصول وضوابط موجود ہیں تو پیمرا ان پر چینل مالکان سے عملدرآمد کیوں نہیں کروا سکتا؟ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں چلنے والا میڈیا اس ملک کی تہذیب وروایات اور اخلاقی قدروں کے مطابق مواد کی فراہمی کا پابند کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہمارے چینل چند ٹکوں کے عوض بھارت کی فلم انڈسٹری اور بھارتی اداکاروں کو فروغ دینے کی خدمت کیوں انجام دے رہے ہیں؟ ہمارے ملک کو سستے بھارتی میڈیا مواد کی منڈی کیوں بنا دیا گیا ہے؟ اور پھر اس پر مستزاد، کاروباری مفادات کی

زنجیروں میں جکڑے، ذرا سی مالی منفعت کی ہڈی پر دُم ہلانے والے ہمارے میڈیا کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آزادیِ اظہار اور آزادیِ صحافت جیسی بڑی بڑی باتیں کرے؟

بھارت میں ہزاروں مسلمانوں کے قاتل ''درندر مودی'' کا برسرِ اقتدار آ جانا جہاں بھارت کے مسلمانوں کے لیے نیک شگون نہیں ہے وہاں پاکستان کے لیے بھی کوئی خوش آئند صورتحال نہیں کہلائی جا سکتی۔ میاں نواز شریف بھارت دوستی کے جس وہم میں مبتلا ہیں اس کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خاصا احتمال ہے کہ مسئلہِ کشمیر جیسے بنیادی معاملے سمیت بلوچستان میں بھارت کی مداخلت اور بھارت کی آبی جارحیت جیسے معاملات سے چشم پوشی کر کے حالات کو معمول پر لانے کی کوششیں کی جائیں۔ بی جے پی جیسی انتہا پسند اور مسلم دشمن، پاکستان مخالف حکومت کے ہوتے ہوئے پاکستان کو بھارت سے تعلقات میں بے حد دانائی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال نریندر مودی کا بھارت میں اپنے تمام کالے کرتوتوں کے باوجود ووٹ حاصل کر لینا آج ٦٧ برس بعد بھی دوقومی نظریے کو اس خطے کی سب سے بڑی سچائی ثابت کر رہا ہے۔ جس ملک کے عوام نے مسلمانوں کے ساتھ درندگی کے صلے میں اس کو ملک کے سب سے بڑے عہدے پر پہنچا دیا، کیا وہاں ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ بقائے باہمی کی کوئی امید رکھی جا سکتی تھی؟

اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیجیے۔ دعاؤں میں یاد رکھنے کی درخواست کے ساتھ!

صائمہ اسما

بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

انسان جسے بجا طور پر اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ دو چیزوں...... مادی خواہشات اور روحانی ضروریات...... سے مرکب ہے۔ خالق کائنات کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے کائنات کی وسعتوں میں انسان کی مادی ضروریات کی تسکین کیلئے وسائل رزق کا ایک ختم نہ ہونے والا خزانہ پیدا فرمایا۔انسان خداداد صلاحیتیوں سے کام لے کر اپنی مادی ضروریات کی تکمیل کیلئے ہر زمانے میں نئی نئی صورتیں نکالتا رہا ہے۔خالق کائنات کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کی روحانی اور اخلاقی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی پورا بندوبست کیا ہے۔ ہرزمانے میں ہرقوم میں خدائے واحد کی طرف سے انبیاءکرام انسانیت کی رہنمائی کیلئے تشریف لاتے رہے۔امتدادزمانہ کے ساتھ ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات فراموش کردیں یا ان کے مذہبی پیشواؤں نے محدود دنیوی مفادات کے لئے ان کی تعلیمات کو طرح طرح کی تاویلات بلکہ تحریفات سے مسخ کر ڈالا۔اب ضرورت ایک ایسی شخصیت کی تھی جو خاتم النبیّین ہو۔جن کی نبوت کا فیضان دنیا کی تمام اقوام اور آنے والے ہر دور کیلئے عام ہو۔جن کی تعلیمات اس طرح محفوظ و مامون ہوں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دستور حیات بن جائیں۔ بعثت محمدیؐ خالق کائنات کی طرف سے انسانیت کی اس ازلی اور ابدی پکار کا حتمی جواب ہے۔

تمام انبیا ورسل ایک ہی دین کی دعوت دیتے رہے۔اس لیے قدرتی بات ہے کہ اس وحدت کا سب سے بڑا عملی مظاہرہ بھی انبیا کرام ہی نے پیش کیا۔ایک طرف انبیا سابقہ ہیں جو اپنے بعد آنے والے نبی آخرالزماںؐ کی آمد اور استقبال کے لئے ذہنی اور فکری طور پر تیار کرتے رہے اور دوسری طرف پیغمبر آخرالزماںؐ ہیں جو گزشتہ انبیا کرام کا نہ صرف عزت واحترام کے ساتھ ذکر فرماتے تھے بلکہ آپؐ نے قرآن میں مذکور پیغمبروں پر خصوصی طور پر ایمان لانے کا حکم دیا اور غیر مذکور پیغمبروں کی نبوت پر عمومی طور پر ایمان لانے

کی روایت کا آغاز فرمایا۔ اس لحاظ سے دو پہلوؤں کا ذکر مناسب رہے گا۔

(۱) آپؐ کی بعثت کا بنی نوع انسان پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ قرآن حکیم نے دنیا کی تمام قدیم اقوام اور دورافتادہ علاقوں میں بھی انبیا کی بعثت کو ایک امرِ واقعہ کے طور پر تسلیم کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المومن: ۷۸)

"اے نبی! تم سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ ان کے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے اور بعض کے نہیں بتائے۔"

اسی طرح قرآن حکیم کے الفاظ میں آپؐ نے گزشتہ تمام انبیائے کرام کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان فرمایا۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۴)

"کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔"

یہی مضمون الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ سورۃ الرعد (۷)، سورۃ یونس (۴۷)، سورۃ الحجر (۸) اور سورۃ النحل (۳۶) میں بیان ہوا ہے۔ وحدتِ انسانی اور بین الاقوامی ہم آہنگی کے لیے اس سے بڑی محکم بنیاد اور کیا ہوسکتی ہے؟

قرآن حکیم میں بیان کردہ اس آفاقی اصول کے بعد یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے صرف ۲۶ پیغمبروں کے اسمائے گرامی قرآن میں درج ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے مصلحین کے نام ہمیں تاریخ میں ملتے ہیں متعین طور پر ان کی حتمی نبوت کی تائید یا یکسر تردید کی پوزیشن میں ہم نہیں ہیں۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان سب بزرگ ہستیوں کا تعلق ایک خاص مدت اور ایک خاص علاقے تک محدود تھا۔ ان کی تعلیمات کی حفاظت کا خدائی بندوبست بھی نہ کیا گیا تھا اور یہ کہ ان کی تعلیمات کے نام پر جو کچھ موجود ہے اس میں رطب و یابس دونوں عناصر موجود ہیں۔ امام غزالیؒ کے بقول قدیم ترین مصلحین اخلاق اور فلسفی حضرات کی بہت ساری مثبت تعلیمات ان کے بیشتر انبیا کرام کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ قرآن وحدیث کے پیش کردہ اس عالمی اصول کے تحت بہت سے مسلمان محققین نے قدیم فلاسفۂ اخلاق اور مذہبی پیشواؤں کے معاملے میں

خاصی وسیع المشربی اور رواداری سے کام لیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک ''واقعہ یہ ہے کہ سقراط کو توحید ہی کی خاطر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اور منصور الحمید کے نزدیک سقراط کا فکر و عمل اسے ایک فلسفی کے بجائے انبیا کی صف میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔ سب سے زیادہ مشکل مہاتما بدھ کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ بدھ کی تعلیمات کے شارحین اور محققین کا اصرار ہے کہ بدھ کے ہاں خدا کا تصور موجود نہیں ہے (یہ الگ بات کہ خدا کی خالی مسند پر خود بدھ کو ہی بٹھا دیا گیا) حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس میں بھی کہیں نہ کہیں تصورِ خدا کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''اے ذات اعلیٰ! مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں۔ جب تو مجھے اپنا لے گا تو میں ہر خوف سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں دوسروں کی بھلائی کے لئے کام کروں گا۔'' مولانا مناظر احسن گیلانی کے نزدیک قرآن حکیم میں ذالکفل کے نام سے جس پیغمبر کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مہاتما بدھ کی شخصیت ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے زردشت کی نبوت کے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی شخصیات...... رام اور کرشن جی...... کی جو تعلیمات ہمارے سامنے ہیں ان میں بھی بعض مقامات پر ابدی حق و صداقت چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ مولانا مودودیؒ کے نزدیک ''بھگوت گیتا تحریف و تنسیخ کے کئی عملوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچتی ہے، اس کے عمیق مطالعہ سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی ایک موحد تھے،'' مثلاً ہندوؤں کی کتاب بھگوت گیتا (خدا کا گایا ہوا گیت) میں درج ہے۔

''وہ جن کی عقل پر خواہشات کے پردے پڑے ہوں، وہ نقلی خداؤں کو پوجتے ہیں۔''

اس طرح اپنشد میں لکھا ہے۔

''خدا محض ایک ہے اور وہ وحدہ لاشریک ہے (ایکم اووتیم) ہے۔''

برسبیل تذکرہ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سامی اور سامی مذاہب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو توحید ہی نہیں سب سے آخری نبی و ہادیؐ کے بارے میں بھی ایسی شہادتیں اور نشانیاں ملیں گی جو صرف اور صرف پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ پر ہی صادق آتی ہیں۔ گویا بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں۔

صرف ایک ہندومت کو ہی لیجیے۔

ہندوؤں کے ذوقِ اصنام پرستی نے ان کے مذہب کو بالآخر ایک ناقابل فہم دیومالا(Mythology)اورایک لاینحل فلسفہ (Philosophy) بناڈالا۔بت پرستی اور تناسخ کے علاوہ عقیدۂ اوتاربھی ہندومت کے ان مشہور اصولوں میں شامل ہے جو دین اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہیں۔اس تصور کے مطابق ذات الٰہی زمانی وقفوں کے بعد لباسِ بشری اختیار کرکے انسانوں کی اصلاح کے لئے روئے زمین پرجلوہ گر ہوتی ہے۔اس عقیدے کوعیسائیوں کےعقیدۂ ابنیت مسیح اورالوہیت مسیح کی طرح ایک طرف رکھ دیا جائے تو آخری رسول......کلکی اوتار...... سے متعلق ان کی بیان کردہ تمام علامات کا مصداق صرف اورصرف پیغمبر اسلامؐ ہیں۔ ڈاکٹر وید پرکاش نے اپنی کتاب ''کلکی اوتار اورنبی کریمؐ'' میں اس دعوے کوٹھوس دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔سنسکرت زبان اور ویدوں کے ماہرین ڈاکٹر گوندکوی راج پروفیسرڈاکٹرشری گوپال چند،کشور شرما، شری رام بھون مشرا، شری اندرشکلا اورڈاکٹر سہائے مصراشاستری نے اس تحقیق کی توثیق کی ہے۔

بقول مصنف مندرجہ ذیل حقائق ناقابل انکار ہیں۔

۱۔کلکی اوتار کے والد کا نام وشنو بھگت (خدا کا غلام)اوروالدہ کا نام سومتی (امن ،سکوت وقرار) ہے۔ ہر دوالفاظ کا ترجمہ بالترتیب عبداللہ اورآمنہ بنتاہے۔جوکہ پیغمبراسلامؐ کےوالدین ہیں۔

۲۔کلکی اوتارکی پیدائش ایک جزیرے میں ہوگی۔ اس سےمراد جزیرہ نماعرب ہے۔

۳۔کلکی اوتارکی بنیادی خوراک کھجوراورزیتون پر مشتمل ہوگی اور وہ انتہائی دیانتدار اور سچے انسان کی حیثیت سےشہرت حاصل کرے گا۔یہ گویا سیرت النبیؐ کی مبادیات ہیں۔

۴۔ویدوں اور مقدس کتابوں کے مطابق کلکی اوتارکوخدااپنے پیغام رساں (فرشتے) کےذریعےتعلیم دے گا اوریہ عمل ایک گپھا (غار) میں انجام پائے گا۔ اشارہ جبرائیل امین اورغارحرا کی طرف ہے۔

۵۔خدااس اوتارکوانتہائی برق رفتارگھوڑا سواری کے لئے دے گا جس پر وہ دنیا کا سفرکرے گا۔اشارہ سفرِمعراج کی سواری براق کی طرف ہے۔

۶۔خدا اپنے اوتارکوغیب سے معجزاتی طور پرامدا دپہنچائے گا۔جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سےغیبی

امداد کی جانب اشارہ ہے۔

۷۔ یہ اوتار زبردست شہسوار اور ماہر شمشیر زن ہوگا۔ غزواتِ نبویؐ میں پیغمبر اسلامؐ نے جو بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے ، ایک زمانہ اس کا گواہ ہے۔

سامی مذاہب...... یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں بھی باہمی اعترافِ عظمت کے نقوش و آثار بہت واضح ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے یہ تاریخی الفاظ اب تک محفوظ ہیں۔:

''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور پہاڑ سے جلوہ گر ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔''

حضرت عیسیٰؑ نے اپنے بعد حضورﷺ کی تشریف آوری کا مژدہ کچھ یوں سنایا:

''لیکن وہ فارقلیط روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ میں نے تمہیں کہی ہیں یاد دلائے گا۔''

(ب) یہ بات کہ پیغمبر اسلامؐ نے مختلف مواقع پر سابقہ انبیا کرام کے ساتھ اظہارِ یک جہتی کر کے وحدتِ انسانی کی مضبوط بنیاد رکھ دی، تاریخ کے بہت سے واقعات سے ثابت ہے۔

سفرِ طائف اور اس کے شدائد کے بعد آپؐ حضرت زیدؓ کے ہمراہ ایک باغ میں قدرے آرام کے لئے تشریف فرما ہوئے۔ باغ کے مالک نے اپنے ایک غلام عداس کو کچھ کھجوریں دے کر آپؐ کے پاس بھیجا۔ نبی کریمؐ نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔ عداس کو تعجب ہوا۔ اس نے کہا: خدا کی قسم! اس شہر میں کوئی بھی شخص اس کلام کو کہنے والا نہیں۔ آپؐ نے عداس سے پوچھا: تم کس شہر کے رہنے والے ہوا اور تمہارا دین کیا ہے؟ اس نے خود کو نصرانی کہا اور اپنا تعلق شہر نینویٰ سے بتایا۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا اس نینویٰ سے جہاں اللہ کے نیک بندے یونسؑ بن متی رہتے تھے۔ عداس نے کہا آپ یونسؑ بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: وہ میرے بھائی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔ عداس نے آپؐ کے دست مبارک اور پیشانی مبارک کو چوم لیا۔ بعض روایات کے مطابق عداس موقع پر مسلمان بھی ہو گیا تھا۔

تاجدارِ انبیاؐ کی ذات اقدس میں اللہ تعالیٰ نے

تمام سابقہ انبیائے کرام کے کمالات خصوصی جمع فرما دیئے تھے۔ پھر بھی آپ ؐ گزشتہ انبیائے کرام کے اعترافِ عظمت کو پسند فرماتے۔ حضرت سلیمانؑ کی حکومت انسانوں کے علاوہ حیوانات، ہوا اور جنوں پر بھی قائم تھی۔

انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (ص: ۳۵)

"اے رب مجھے معاف کردے اور مجھے وہ بادشاہی دے دے جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو۔ بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔" حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تسخیرِ قوم جنّ پر رسول ؐ کو بھی قدرت حاصل تھی۔ پھر بھی آپ ؐ نے اپنے اس اعزاز کا مظاہرہ مناسب نہ سمجھا۔ آپ ؐ نے فرمایا: گزشتہ رات ایک سرکش جن نے اچانک میری نماز میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کو پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دوں تا کہ تم سب دن کے وقت اسے دیکھ سکو، مگر اس وقت مجھے اپنے بھائی سلیمانؑ کی دعا یاد آ گئی اور میں نے اس جن کو ذلیل کر کے چھوڑ دیا (بخاری)

فتح مکہ کے موقع پر نبی مکرمؐ نے اپنے خون کے پیاسے مفتوحین کے لئے عام معافی کا اعلان کرتے وقت فرمایا "آج میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنیوالا ہوں جو حضرت یوسفؑ نے (مقتدر ہونے کے بعد) اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔" یعنی آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ تم سب آزاد ہو۔" سب جانتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ استقامت کا کوہِ گراں تھے، پھر بھی حضرت یوسفؑ کی عزت افزائی کرتے ہوئے آپ ؐ نے فرمایا "اگر میں اتنی دیر ناحق جیل میں رہا ہوتا جیسا کہ حضرت یوسفؑ رہے اور مجھے رہائی کے لئے بلوایا جاتا تو میں یہ رہائی فوراً قبول کر لیتا۔"

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ کسی پیغمبر کے ساتھ آپ کا تقابل اس طرح کیا جائے کہ کسی دوسرے پیغمبر کی تحقیر کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ ایک یہودی نے ایک صحابی کے ساتھ بحث کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کو حضورؐ سے افضل کہہ دیا۔ صحابی نے غصہ میں آکر اس پر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ یہودی نے دربارِ رسالتؐ میں استغاثہ دائر کر دیا۔ آپ ؐ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا اور ساتھ فرمایا "دوسرے پیغمبروں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے میری تعریف میں مبالغہ

نہ کیا کرو۔ روز قیامت جب سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے میں آنے والوں میں سب سے پہلا ہوں گا اور موسیٰ اللہ کے تخت کے برابر کھڑا دیکھوں گا۔ موسیٰ اللہ تعالیٰ کے فرش کا ایک پایہ پکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہوں گے یا انہیں کوہِ طور پہ بے ہوشی کا بدلہ دیا گیا ہو گا۔''(بخاری جلد۲ کتاب التفسیر سورۃ الاعراف)

(حوالہ کتاب: محمد رسول اللہ ﷺ مستشرقین کے خیالات کا تجزیہ ادارہ معارف اسلامی)

☆☆☆

ڈاکٹر آسیہ شبیر

تزکیہ کرنے والے نبی ﷺ

حضور ﷺ کا اسوۂ تعلیمی:

دورجدید میں جن تدریسی مہارتوں اور طریق کار(Teaching Skills and Methodologies) کو اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں میں باقاعدہ کلاسوں کی صورت میں سکھایا جارہاہے، سیرت النبی ﷺ اور سیرت انبیاء کرامؑ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ تدریسی اسلوب، اور یہ مطلوب صفات تمام انبیاء کرامؑ کا خاصہ تھیں۔ اورخاص طور پر عالم انسانیت کے آخری معلمؐ کوان صفات سے بدرجہ اتم مزین کیا گیا۔

اے کہ برتخت سیادت ، زازل
جاداری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

تزکیے کی روح میں گندھی اس تعلیم نے دنیا کا سب سے زیادہ پائیدار اورانسانیت کے لئے نافع انقلاب برپا کیا۔

نبی کریم ﷺ کے اسوۂ تعلیمی میں جامعیت ہے۔ کتب حدیث کے سینکڑوں اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس مختصر مضمون میں بس اتنا مطلوب ہے کہ وہ چندنمایاں ترین خصائص جو دورِ جدید کی تعلیمی حکمت عملی کے ماہرین، ایک بہترین استاد کے لئے تجویز کرتے ہیں، ان کی محض ایک جھلک اسوۂ نبیؐ میں دکھائی جا سکے۔

1۔تدریس پیشہ نہیں، مشن ہو:

ایک اچھے استاد کی خوبیوں میں سرفہرست یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ تدریس کو صرف پیشہ ورانہ ذمہ داری نہ سمجھے، بلکہ یہ اس کا مشن ہو۔ قصص الانبیاء میں قرآن مجید نے ہر نبی کی زبان سے کہلوایا ہے کہ میں اس کارنبوت پرتم سے کسی اجر کا خواہاں نہیں ہو۔ یہی اسوۂ نبیؐ مہربان کا بھی رہاہے۔ اجرتو بہت دور کی بات ہے، قرآن مجید نے اہل ایمان کی ہدایت اوربھلائی کے لیے نبی کریم ﷺ کے ''حریصٌ علیکم'' ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ جنھوں نے ایمان قبول نہیں کیا، ان کے لئے آپ ؐکی قلبی کیفیات کیا تھیں، بیان الٰہی سے بڑھ کرکون سے الفاظ یہ نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔

فلعلک باخع نفسک علی آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفا (الکہف۔6)

جان گھلا دینے کی اس کیفیت سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نصیحت فرمائی کہ اگر یہ منہ پھیریں تو آپ ان کے نگران اور ان کی گمراہی کے ذمہ دار نہیں۔

فان اعرضوا فما ارسلنٰک علیھم حفیظا ان علیک الا البلٰغ (الشوریٰ۔48)

نبی ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ ہدایت دینا صرف اللہ ہی کا کام ہے اس کے باوجود اپنے مخاطبین کے ایمان کے لئے جس قدر مشتاق تھے، اس پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت بھرا زجر اور تنبیہ کی گئی۔

وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتأتیھم بایة، ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدی فلاتکونن من الجاھلین (الانعام۔35)

یہ عتاب درحقیقت نہ ماننے والوں پر تھا نبی کریم ﷺ پر نہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت میں واضح کیا گیا ہے۔

انما یستجیب الذین یسمعون۔ والموتی یبعثھم اللہ ثم الیہ یرجعون (الانعام۔36)

دعوتی زندگی کے مشکل ترین مراحل میں بھی آپؐ کی یہ خصوصیت ماند نہیں پڑتی دکھائی دیتی۔ اہل طائف نے آپؐ سے جو سلوک کیا، خود آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے سوال پر اپنی زندگی کا سخت ترین دن قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ یہ لوگ مبتلائے عذاب کیے جائیں اگر آپؐ چاہیں۔ لیکن آپؐ کا جواب ایک پرسوز داعی کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

بل ارجوان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ وحدہ لایشرک بہ شیئا (بخاری)

احد کے مشکل اور صبر آزما موقع پر تکلیف کے باوجود آپؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بس اتنا تھا۔

اللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون (طبقات ابن سعد)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احکام وہدایات کی تعلیم دینے کی جو ذمہ داری آپؐ پر ڈالی گئی تھی، اس کی ادائیگی کے ذوق شوق، اضطراب اور اس راہ میں ذاتی تکالیف اور مصائب کو خاطر میں نہ لانے کی اور صبر

وتحمل کی اس سے بڑی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

2۔طلبہ سے مضبوط شخصی روابط:

طالب علموں سے استاد کے ذاتی روابط، افہام وتفہیم میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔بے تکلفی کی فضا میں سوال کرنا آسان اور مخاطب کو جاننے کی وجہ سے ذہنی سطح کے مطابق جواب دینا ممکن ہوتا ہے۔آج کی تدریسی مہارتوں میں یہ ہنر پیدا کرنے کے کئی طریقے سکھائے جارہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں اپنے ساتھیوں سے محبت اور محبوبیت کے مناظر جابجا ملتے ہیں۔

نبی مہربان ﷺ کے اخلاق ومعاملات اور منصب نبوت ورسالت کی وجہ سے آپؐ کے اصحابؓ پر تو محبت لازم وواجب تھی۔لیکن آپؐ جس والہانہ انداز میں محبت فرماتے اور اس کا اظہار......اس نے بھی صحابہؓ کو آپؐ کا گریدہ بنادیا تھا۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ نے آپؐ کو اپنے والدین پر ترجیح دی تھی۔آپؐ نے انہیں متبنّٰی بنالیا اور جب تبنیت کی ممانعت آئی تو فرمایا: زید مجھے سارے انسانوں میں محبوب ہیں۔ان کے بیٹے اسامہ بن زید ''حب رسول اللہ'' محبوب رسول ﷺ مشہور تھے۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ،حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لئے فرماتے ہیں کہ ہم انہیں اہل بیت میں سمجھتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے گھر بہت آمدورفت کی وجہ سے اور اپنی عادات واطوار میں نبیؐ سے مماثلت کی وجہ سے۔(بخاری)۔یہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: نبی کریمؐ نے مجھے اس طرح تشہد سکھائی جیسے آپؐ مجھے قرآن کی سورت سکھاتے تھے اور اس وقت میری ہتھیلی آپؐ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھی۔(بخاری)

ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ میں بس گئے تو انصار کے ساتھ محبت کا معاملہ رکھا۔ایک مرتبہ جب ان کی عورتیں اور بچے کسی شادی کی تقریب سے واپس آرہے تھے، نبی ﷺ کھڑے ہوئے اور تین مرتبہ فرمایا: **اللھم انتم احب الناس الیّ**(بخاری)۔سعد بن معاذؓ سید اوس تھے۔ایک موقع پر تشریف لائے تو نبی محترم ﷺ نے فرمایا: **قوموا الی خیرکم او سیدکم**(بخاری)۔یہ اس حال میں فرمایا کہ آپؐ اپنے لیے بھی اپنے ساتھیوں کے کھڑے ہونے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید سپاہیانہ صلاحیتوں سے ممتاز تھے۔آپؐ نے انہیں ''**سیف من سیوف اللہ**''(بخاری) کا خطاب دیا۔حضرت معاذ بن

جبلؓ کے ہاتھ کو تھام کر فرمایا: اے معاذؓ! اللہ کی قسم میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اور میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ کسی فرض نماز کے بعد یہ کہنا نہ چھوڑنا: اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شانے کو تھام کر فرمایا: کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (بخاری)۔ اتنی محبت سے کہی جانے والی بات کون سا شاگرد فراموش کرسکتا ہے۔

مسائل اور پریشانی کے معاملات میں تو نبی کریم ﷺ کی توجہ اپنے ساتھیوں پر کئی گنا بڑھ جاتی۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے والد غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔ یہ کم سن تھے۔ والد قرض اور بہت سی بہنوں کی ذمہ داری ان پر چھوڑ کر گئے۔ حضور ﷺ ان کی غیر معمولی خبر گیری رکھتے۔ جابرؓ نے شادی کی تو بطور خاص پوچھا: کنواری سے کی ہے یا شادی شدہ سے؟ یہ بھی فرمایا کہ باکرہ سے کرتے (ابوداؤد)۔ ان کے قرض کا معاملہ تھا تو خود جا کر کھجوریں تلوا کر قرض خواہوں میں تقسیم کیں تاکہ برکت ہو (بخاری) جابرؓ فرماتے ہیں: یوں کھجوریں بچ بھی گئیں۔ ایک سفر میں ان سے اونٹ خریدا، جو بہت کم رفتار تھا۔ مدینے جا کر قیمت بھی واپس فرمادی اور اونٹ بھی انہیں ہی عطا فرما دیا (ترمذی)۔ جابرؓ فرماتے ہیں: اونٹ والی رات آپؐ نے میرے لیے پچیس مرتبہ استغفار فرمایا (ترمذی)

یہ محبت عام تھی۔ مدینہ میں آکر جب مسلمانوں کو کشادگی حاصل ہوئی تو آپؐ نے فرمادیا کہ جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے گا، اس کے قرض کی ذمہ داری مجھ پر ہے (بخاری) ایک قبیلے کے مفلوک الحال لوگ مدینے آئے تو نبیؐ بے قرار ہوگئے۔ منبر پر جا کر خطبہ دیا۔ جب ان کے لیے کافی سامان اکٹھا ہوا تو آپؐ کی بے قراری دور ہوئی۔ (مسلم)

اس محبت اور محبوبیت کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ ہمہ تن آپؐ کی طرف متوجہ رہتے تھے وہ جب حدیث نبوی بیان کرتے تو ساتھ نبی کریم ﷺ کی کیفیات کا نقشہ بھی کھینچتے۔ آپ مسکرائے، غصے میں تھے، آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ یہ محبت نہ ہوتی تو جیسا بیان سیرت وحدیث آج مسلمانوں کو میسر ہے، وہ نہ ہوتا۔ اسی محبت نے انہیں نبی کریمؐ کے مقاصد سے جوڑ دیا تھا...... اور اس جدوجہد سے، جس کی راہ میں بے پناہ مصائب تھے۔ غزوہ بدر سے پہلے نبی کریمؐ نے اپنے اصحاب سے مشاورت کی۔ مہاجرین میں

سے حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''ہم آپؐ سے وہ نہیں کہیں گے جو اصحاب موسیٰ ؑ نے کہا تھا: **اذھب انت وربک فقاتلا**

بلکہ ہم آپؐ کے دائیں، آپؐ کے بائیں، آپؐ کے سامنے اور آپؐ کے پیچھے لڑیں گے۔''

اس حدیث کے راوی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبی ﷺ کا چہرہ اس جواب سے دمک اٹھا (بخاری)۔ حضرت سعد بن معاذؓ انصار کی طرف سے نمائندگی کو اٹھے اور فرمایا:

''اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اگر آپؐ ہمیں لے کر سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں کود جائیں تو ہم آپؐ کے ساتھ کود یں گے اور ہم میں سے کوئی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہمیں یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلے میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہم سے وہ کچھ دکھلا دے جسے دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ (ابن ہشام)۔ غزوۂ بدر کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ صحابہ کرامؓ اپنے ان دعووں میں سچے ثابت ہوئے۔

یہ محبت ہی ہے جو استاد کو نرمی کی طرف، رفق و مہربانی اور درگزر کی طرف مائل کرتی ہے۔ کلام کو دل میں گہرا اتارتی ہے۔ مقاصد اور نصب العین میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ بلاشبہ اس محبت میں سے معلم انسانیت کو حظ وافر عطا ہوا تھا۔

موثر نظم وضبط:

تعلیمی زندگی میں نظم وضبط کی اہمیت مسلمہ ہے۔ نظم وضبط قائم کرنا استاد کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے اور اس کی مہارت کا امتحان بھی۔ کلاس روم اور ادارے میں اس کی تربیت کے بعد زندگی بھر کے لئے اس کو طلبہ کی عادات میں شامل کر دینا فرد اور معاشرے پر استاد کا احسان ہے۔

حضور ﷺ کے اسوہ تعلیمی میں اس حوالے سے بھی بہترین نمونہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی اپنی کتاب ''انسان کامل'' میں لکھتے ہیں کہ ''ایک دائرہ تو آپ کی غیر رسمی تعلیم کا تھا۔ یہاں ہمہ وقت تعلیم جاری رہتی تھی، چلتے پھرتے، بازاروں، گھروں اور راستوں میں۔ دوسرا دائرہ اہتمام کے ساتھ تدریس کا تھا۔ اس کا اولین مرکز دارارقم بنا، بعدازاں دارِ نبی ﷺ اور بالآخر مسجد۔'' مسجد کے مرکز تعلیم ہونے سے اسلامی تعلیم نئی

جہات سے آشنا ہوئی۔اس پاکیزہ اور مقدس ماحول میں تزکیہ کا رنگ تعلیمی عمل میں رچ بس گیا۔ یہاں چونکہ آدابِ مسجد کے منافی کام ناپسندیدہ تھے، چنانچہ یکسوئی تعلیم وتعلم کی طرف ہی رہتی۔اوراس مکتب کے طالب علم دنوں میں وہ کچھ سیکھتے جو دوسرے برسوں میں سیکھ پاتے ہیں۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں:صحابہؓ جب صبح نماز پڑھ لیتے تو حلقوں کی صورت میں بیٹھ جاتے۔ قرآن مجید پڑھتے اورفرائض وسنن سیکھتے (مجمع الزوائد)۔

نبی کریم ﷺ نے ویسے بھی ان کی توجہ علوم نافع سیکھنے کی طرف مبذول کروارکھی تھی۔مسجد کے باہر ہی تیراندازی، دوڑ، کشتی وغیرہ کے مقابلےاورمشق کی جاتی تھی۔

اس تعلیمی نظم وضبط نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے اثرات دکھائے۔مثلاً جہاد کا میدان اس کی نمایاں مثال ہے۔قتل وغارت گری اورسلب ونہب مدتوں سے عربوں کا شعار تھا۔ بہت سے قبائل کی معیشت اسی سے وابستہ تھی۔ مدینے آنے کے بعد اور فرضیت جہاد کا حکم آنے کے بعد نبی ﷺ نے اسی ڈسپلن کو معیار بنا کر جہاد اور قتل وغارت میں فرق کو واضح فرمایا۔

مقاصد جہاد کے باب میں آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے سوالات کے جواب میں کئی بار صراحت فرمائی کہ مال کے لئے لڑنا جہاد نہیں، شہرت وناموری کے لیے لڑنا بھی نہیں۔صرف ''من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله (ابن ماجہ)۔ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ جس نے اونٹ باندھنے کی رسی کی نیت بھی رکھی، اس کو (جہاد کا اجرنہیں) وہی شے ملے گی، جس کی اس نے نیت کی تھی (نسائی)۔ قتال اور جنگ کے آداب مقرر فرمائے۔یہ طے فرمادیا کہ کن کو قتل کیا جاسکتا ہے اورکن کونہیں۔فصلوں اور کھیتوں کو نقصان پہنچانے اورلوٹ مار سے منع فرمادیا۔''لوٹ کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں ہے۔'' (ابوداوٗد)۔مال غنیمت کی ایک سوئی بھی اپنے امام کے پاس جمع کروانے کا پابند بنایا (ابوداوٗد)۔عرب اتنی پابندیوں اور بندشوں کے کہاں عادی تھے۔وہ بھی میدان جنگ میں۔لیکن نبی مہربانؐ کی تعلیم وتلقین، تزکیہ وتربیت کے یہ ثمرات تھے کہ آنے والے سالوں میں مسلمانوں کی اس منظّم سپاہ نے اپنے وقت کی بڑی طاقتوں کی فوجوں کی صفیں الٹ دیں۔

معاشرتی میدان میں جو ڈسپلن آپؐ نے پیدا فرمایا، اسکی روح مساوات تھی۔ قانون، ضابطے اور اصول سب کے لئے یکساں تھے۔ اسامہ بن زیدؓ آپؐ کے محبوب تھے، لیکن حدود کے معاملے میں ان کی سفارش کرنے پر آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔ فاطمہ مخزومیہ بھی کسی کم مرتبہ خاندان سے نہ تھیں، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی ایسا فعل کرتیں تو یہی سزا پاتیں (بخاری)۔ حقوق، فرائض، احکام اور معاہدات واضح اور متعین تھے اور باز پرس ممکن۔ نبیؐ خود اپنے آپ کو بدلے کے لئے پیش کر دیتے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں ایسی سینکڑوں مثالیں قائم ہوئیں کہ قضاۃ نے بلا تکلف حکام وقت اور سلاطین کے خلاف فیصلے دیئے۔

☆☆☆

ہم کیا پی رہے ہیں؟

تازہ پانی انسانوں کے لئے حیات بخش ہے۔مگر اس سے بننے والے معروف و مقبول مشروبات کن اجزا سے مرکب ہیں، موسم گرما کے آغاز پر یہ جاننا ہمارے لئے فائدہ مند ہوگا۔

اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کو برقرار رکھنے میں پانی انتہائی اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے خزانوں میں پانی کا وافر ذخیرہ رکھا ہے۔ پھر اس پانی کی تقسیم کا ایسا نظام وضع کیا کہ وہ انسانوں کو تازہ حالت میں فراہم ہوتا رہے۔ اس بات کو اللہ نے قرآن میں ایک سے زیادہ جگہوں پر بیان کیا ہے۔ مثلاً:

''اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ زمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح سے پھل نکال لاتا ہے۔'' (الاعراف۔57)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے۔ پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے۔'' (النور۔43)

''وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں۔'' (النحل 11-10)

پانی نہ صرف غذا کا اہم ترین جز ہے بلکہ تفریح کا ایک بڑا ذریعہ بھی۔ پانی کی سطح پر سفر ایک سستا اور آسان ذریعہ رہا ہے۔ انسانی تہذیب پانی کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ پانی انسانوں کے مابین وجہ نزاع بھی رہا، انفرادی اور قومی سطح پر بہت سی لڑائیاں صرف پانی

کے لئے ہوئیں۔ پانی سے ایک جانب پاکیزگی اورنظافت کا حصول ممکن ہے اور دوسری جانب کئی امراض اسی کے ذریعہ پھیلتے ہیں۔

سطح زمین پر پانی کی مقدار ابتدائے آفرینش سے آج تک یکساں رہی۔ زمین کی سطح کا ستر فیصد (۷۰%) حصہ سمندروں سے ڈھکا ہوا ہے۔جن میں اندازاً تین سوچھبیس ملین ٹریلین گیلن پانی کا ذخیرہ ہے، زمین پر موجود پانی کا ستانوے فیصد (۹۷%) حصہ سمندروں میں ہے۔ پانی کا چکر مسلسل چل رہا ہے۔ ہر لمحہ جس قدر پانی بخارات کی شکل میں سمندروں سے اڑتا ہے اسی قدر پانی شبنم اور بارش کی صورت میں واپس زمین پر آتا ہے اور پھر ندی نالوں، دریاؤں سے ہوتا زمین کو سیراب کرتا ہوا واپس سمندروں میں پہنچ جاتا ہے۔ یوں سمندروں میں پانی کی مقدار برقرار رہتی ہے۔

زمین پر موجود پانی کی صرف تین فیصد مقدار تازہ حالت میں موجود ہے۔اس میں سے بھی 16% قطبین اور گلیشیر میں برف کی حالت میں موجود ہے۔ جب کہ 0.36% زیر زمین سوتوں میں ہے۔ کل پانی کا 0.36% حصہ ہی جھیلوں یا دریاؤں میں ہے۔ پانی کی کچھ مقدار ہوامیں بخارات یا بادلوں کی صورت میں تیرتی رہتی ہے اور کچھ پودوں اور جانوروں کے جسموں میں مقید ہے۔انسانی جسم کا 65% حصہ پانی پر مشتمل ہے۔

پانی واحد شے ہے جوٹھوس، مائع، گیس ہر حالت میں زمین پر پایا جاتا ہے۔اس کے باوجود اس کو خود کسی کارخانے میں تیار کرنا قریباً ناممکن ہے۔ پانی کے موجود ذخائر کو کام میں لانے کے بیشمار طریقے ہیں۔ وسیع ذخائر کے باوجود زمین پر موجود انسانوں میں سے بیس فیصد کے لئے پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔

بیشمار افراد اور بالخصوص خواتین کے دن کا زیادہ حصہ خاندان کی ضروریات کے لئے دور دراز سے پانی لانے میں صرف ہوجاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں ایک دن میں خواتین کے بیس کروڑ گھنٹے پانی حاصل کرنے میں صرف ہوجاتے ہیں۔ ہر اکیس سکینڈ بعد ایک بچہ پانی سے متعلق کسی بیماری کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

ایک اندازہ کے مطابق صاف پانی کی فراہمی، صفائی اور صرف ہاتھ دھو کر کھانے پینے سے پانی سے متعلق بیماریوں سے ہونے والی نوے فیصد سے زائد اموات سے بچاؤ ممکن ہے۔

صحت کے ادارے پانی سے متعلق جن بیماریوں کو گنواتے اور بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنے کی تجاویز دیتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

وہ بیماریاں جن کے جراثیم پانی میں شامل ہوکر اسے آلودہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہیضہ، ٹائیفائڈ، پولیو، یرقان وغیرہ۔

وہ بیماریاں جو پانی کی کمیابی ے باعث صفائی اور پاکیزگی کی مطلوبہ معیار برقرار نہ رکھنے کے باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً جلد کی بیماریاں، پھوڑے، پھنسیاں وغیرہ۔

وہ بیماریاں جو پانی میں موجود مضر کیمیائی یا تابکاری اجزاء کے شامل ہونے کے باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً سیسہ (Lead)، تانبہ کے مرکبات وغیرہ

وہ بیماریاں جو پانی میں غیر مفید کیڑے مکوڑوں کی افزائش سے ہوتی ہیں مثلاً ملیریا، ڈینگی وغیرہ۔

وہ بیماریاں جو پانی کی کیمیابی کے باعث غذا کی مطلوبہ ضرورت پوری نہ ہونے کے باعث ہوتی ہیں مثلاً قحط کی صورتحال، مویشیوں کا اتلاف وغیرہ۔

پاکستان میں 62% شہری اور 84% دیہاتی آبادی کو صاف پانی میسر نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہر سال دس کروڑ اسہال کے مریض ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں۔ اندازاً ڈھائی لاکھ بچے پانی سے متعلق بیماریوں کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ پانی سے متعلق یہ اعداد وشمار مکمل حقائق سامنے نہیں لاتے۔ انسان جو مشروبات استعمال کرتے ہیں وہ صرف ''سادہ پانی'' ہی نہیں، اس کو ذائقہ دار بنانے کے لئے متعدد اشیاء ملا کر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ ان مشروبات کے انسانی جسم پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے کون سے مفید ہیں اور کون سے مضر! صحت کے ادارے اس معاملہ میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ نجانے یہ طرزِ عمل مشروبات ساز کمپنیوں کے معاشی مفادات کی حفاظت کے لئے ہے یا یہ ادارے ان مضر اثرات کو اہم سمجھنے ہی سے قاصر ہیں۔

مشروبات میں آج سب سے زیادہ استعمال میں لائے جانے والے سوڈا مشروبات ہیں۔ نہ صرف ان کا استعمال روز افزوں ہے بلکہ اشتہاری مہموں کے ذریعہ ان کو فروغ دینے میں متعدد ادارے تعاون کرتے ہیں۔ مثلاً قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی کھیلیں انہی کے تعاون سے ہوتی ہیں۔ یوں ایک دوسرے کے

معاشی تحفظات میں اشتراک سے کام چلتا ہے۔ ان مشروبات کی کھپت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں ایک سال میں ہر امریکی اوسطاً چھپن گیلن سوڈا نوش کر لیتا ہے۔

ان مشروبات کے لئے ''سافٹ ڈرنک'' (Soft Drink) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

سافٹ ڈرنک:

یہ اصطلاح ہارڈ (Hard) کے مقابلہ میں استعمال ہوتی ہے۔ ''ہارڈ ڈرنک'' ان مشروبات کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں الکوحل کی مقدار 0.5 فیصد سے زائد ہو۔

کسی مشروب میں 0.5 فیصد یا اس سے کم الکوحل کی موجودگی کے باوجود اسے سافٹ ڈرنک ہی کہا جاتا ہے۔

اجزائے ترکیبی:

''سافٹ ڈرنک'' کئی ناموں سے پائے جاتے ہیں۔ ان مشروبات کی تیاری میں پانی (اکثر کاربن ڈائی آکسائڈ ملا ہوا Carbonated) میٹھا (شکر یا کوئی دوسرا کیمیائی مادہ مثلاً ایسپرٹیم Aspartame)، ذائقہ کے لئے کوئی دوسری چیز، کیفین، رنگ، خوشبویات اور دیر تک کارآمد رکھنے کے لئے دوسرے کیمیائی مادے (Preservatives) شامل کیے جاتے ہیں۔ بعض میں 0.5 فیصد یا اس سے کم الکوحل بھی موجود ہوتی ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ استعمال میں لایا جانے والا مشروب کوکا کولا ہے جب کہ دوسرے نمبر پر پیپسی کولا ہے۔ اول الذکر میں کوکین اور مؤخر الذکر میں پیپسن شامل کی جاتی ہے جو کہ ان کے ناموں سے بھی ظاہر ہے۔ تمام کالے مشروبات میں کیفین شامل ہوتی ہے۔ کوکا کولا کی تین سو ملی لیٹر کی مقدار میں کوئی 35 گرام کیفین موجود ہے۔

اگرچہ پھلوں کے رس اور چائے بھی الکوحل کی عدم موجودگی کے باعث اسی تعریف میں آتے ہیں، لیکن انہیں اس گروپ میں شامل نہیں کیا جاتا۔

تاریخی پس منظر:

سافٹ ڈرنک یورپ میں سترھویں صدی میں تیار کیے جانے لگے۔ ابتدا میں پانی میں لیموں کا رس اور شہد ملا کر مشروب تیار کیا گیا (سکنجبین) اور اسے تجارتی بنیادوں پر فروخت کرنے کا آغاز ہوا۔

اٹھارویں صدی (1767ء) میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس دباؤ کے ساتھ پانی میں شامل کر کے

مشروبات تیار کیے جانے لگے۔ اس مقصد کے لئے چاک پر سلفیورک ایسڈ ڈالنے سے کاربن ڈائی آکسائڈ گیس حاصل کی جاتی ہے۔ مشروب کو ذائقہ دار بنانے کے لئے متعدد اشیا شامل کی جانے لگیں جن میں شکر، پھلوں کا رس، جڑی بوٹیوں کا رس، کوکین، پیپسن، خوشبویات اور دوسرے کیمیائی مادے شامل ہیں۔ بعض میں الکوحل بھی معمولی مقدار (0.5 فیصد یا اس سے کم) ملادی جاتی ہے۔ مشروبات میں ملائی جانے والی شکر میں خمیر پیدا ہونے (Fermentation) سے بھی الکوحل بن جاتی ہے۔ جلد ہی یہ مشروبات مقبولیت پانے لگے۔ حتیٰ کہ یورپ کی دیگر مصنوعات کے ساتھ ان مشروبات نے بھی عالمگیر مقبولیت حاصل کرلی۔ آج یہ دنیا میں سادہ پانی کے بعد سب سے زیادہ استعمال میں لائے جانے والے مشروبات میں شمار ہوتے ہیں۔

غذائی اجزاء:

سوڈا مشروب کے سو گرام میں

حرارے	38
چکنائی	صفر
حیاتین	صفر
لحمیات	10 ملی گرام
شکر	10 گرام
سوڈیم	4 ملی گرام
پوٹاشیم	2 ملی گرام
کیفین	8 ملی گرام

یہ تو وہ معلومات ہیں جو مہیا کی گئی ہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان مشروبات کا پورا اور اصل فارمولا کبھی بیان نہیں کیا جاتا اور اسے اخفا میں رکھا جاتا ہے۔

سوڈا مشروبات کے صحت پر اثرات:

ان مشروبات کا صحت پر کیا اثر ہوتا ہے؟ ان اثرات کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا معمولی یا متعدل استعمال بھی صحت کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

مثبت اثرات:

شدید پیاس میں یہ مشروبات تشنگی کا احساس فوراً ختم کردیتے ہیں۔ خون میں شکر کی مقدار تیزی سے بڑھ جاتی ہے چنانچہ وقتی طور پر آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں سوڈے کی موجودگی مرغن غذا کے ہضم ہونے کا تاثر دیتی ہے۔

منفی اثرات:

1۔ایک سوڈا بوتل میں بہت بڑی مقدار میں شکر استعمال ہوتی ہے۔چینی کی یہ مقدار خون میں شکر کی سطح بہت بلند کر دیتی ہے۔اس کے ردعمل میں لبلبہ کثیر مقدار میں انسولین پیدا کرتا ہے۔جسم میں مسلسل ہونے والا یہ عمل ذیابیطس اوروزن میں اضافہ کے علاوہ کئی دوسرے مسائل کا سبب بن سکتا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں چینی کی سب سے زیادہ کھپت ان مشروبات کی تیاری میں ہوتی ہے۔

2۔ سوڈا مشروبات میں فاسفورک ایسڈ موجود ہے، جو جسم میں کیلشیم کے انجذاب کی صلاحیت میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ کیلشیم اور فاسفورس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ ہڈیوں میں کیلشیم کی مطلوبہ مقدار داخل نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ ہڈیاں کمزور ہوجاتی ہیں۔ ان میں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ کھوکھلی اور بھربھری ہوجاتی ہیں۔

ان کی بیماریاں پیدا ہونے کا(Osteoporosis اور Osteomalacia) کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چھ گلاس دودھ پینے سے جس قدر کیلشیم اورقوت حاصل ہوتی ہے وہ ایک گلاس سوڈا مشروب پینے سے زائل ہوجاتی ہے۔

یوں سوڈا مشروبات کے کثرت استعمال سے بچوں کی نشونما پر برااثر ہوتا ہے۔ وہ مضبوط جسم کے مالک نہیں بن پاتے۔

بڑھاپا جلد آتا ہے۔ پٹھوں اور جوڑوں کے درد اکثر ہوتے ہیں۔ ہڈی ٹوٹنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

3۔ فاسفورک ایسڈ معدے کے معمول کے تیزابی مادے کو بھی متاثر کرتا ہے چنانچہ ہاضمہ کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔غذائی اجزاء پوری طرح ہضم نہیں ہو پاتے۔غیر ہضم شدہ غذا آنتوں میں پوری طرح جذب نہیں ہو پاتی یا پھر الرجی کا سبب بن جاتی ہے۔

4۔ ڈائٹ سوڈا میں حرارے کم یا ختم کرنے کے لئے چینی کی بجائے کیمیائی مرکبات(Aspartame) استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ مرکبات سو کے قریب صحت کے مختلف مسائل پیدا کرنے میں معاون پائے گئے ہیں۔ یہ کیمیائی مادہ معمولی حرارت پر میتھانول میں تبدیل ہوجاتا ہے، جو بعدمیں فارمیلڈی ہائیڈ اورفارمک ایسڈ میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ یہ دونوں زہریلے مادے جسم پر انتہائی مضراثرات رکھتے ہیں۔

دماغ پران کے اثرات بہت سنگین ہیں۔ جذباتی ہیجان (Emotional Disorders)، ذہنی صدمات، جھٹکے

لگنا(Seizures)، دماغ کی رسولیوں کا بننا (Brain Tumours)، خون کی نالیوں کی خرابی (Multiple Sclerosis)، میٹابالک سنڈروم (Metabolic Syndrome) کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ پیٹ پر چربی چڑھ جاتی ہے۔خون میں شکراور کولیسٹرال کی مقدار بلند ہوجاتی ہے۔

5۔سوڈا مشروبات میں سے اکثر میں (بالخصوص کالے مشروبات) کیفین کی بڑی مقدار موجود ہے۔ کیفین بہت سے لوگوں میں کئی مسائل پیدا کرتی ہے۔ اس سے بے چینی اور بے خوابی پیدا ہوتی ہے۔حرکت قلب کی بے ترتیبی (Arrhythmias)، بلند فشار خون، چھاتی کی رسولی، کینسر اور کئی دیگر مسائل کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔

6۔ ہارورڈ میں ہونے والی ایک ریسرچ میں موٹاپے اور سوڈا مشروبات کا براہ راست تعلق پایا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق سوڈا کی ہر بوتل موٹاپے کے خطرہ کو 1.6 گنا بڑھا دیتی ہے۔

7۔ ان مشروبات میں استعمال ہونے والا پانی عام نلکے کا پانی ہوتا ہے۔اس پانی میں کلورین، فلورائڈ اور کئی دوسرے مادے بلکہ جراثیم بھی موجود ہوسکتے ہیں۔جو اپنی جگہ کئی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔

8۔ بعض مشروبات میں فرکٹوز کارن سیرپ (Fructose Corn Syrup) شامل کیا جاتا ہے۔ میٹھا کرنے والا یہ محلول مکئی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن جس مکئی سے یہ حاصل کیا جاتا ہے وہ جینیاتی طور پر تبدیل شدہ ہے۔ جینیاتی تبدیلیوں کا عمل پچھلی صدی کی نوے کی دہائی (1990 کے بعد) میں شروع ہوا۔ ابھی تک اس طرح حاصل ہونے والی اجناس کے صحت پر اثرات کا درست طور پر اندازہ نہیں لگایا جاسکا اس لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم یہ محلول بنانے میں پارہ (مرکری) کی کچھ مقدار شامل ہوتی ہے جو کئی قسم کے صحت کے مسائل پیدا کرسکتی ہے۔

9۔شکر کی زیادہ مقدار، سوڈیم اور کیفین جسم میں پانی اور نمکیات کے توازن (Electrolyte Balance) کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔یوں جسم پانی کی قلت کا شکار ہوسکتا ہے۔

10۔ان مشروبات کا کثرت سے استعمال دانتوں پر ایک تہہ چڑھا دیتا ہے جس کے باعث دانت کمزور پڑ جاتے ہیں (Dental Caries) چنانچہ دانتوں میں خلا پیدا ہوجاتا ہے۔ مسوڑھوں کی سوزش اور دوسرے مسائل

کے باعث دانت جلد گرنے لگتے ہیں۔شکر کی تہہ دانتوں پر جمنے سے شکر کی خمیر (Fermentation) اٹھنے سے تیزاب پیدا ہوتا ہے جو دانتوں کے قدرتی غلاف (Enamel) کو ختم کر دیتا ہے۔جس سے دانتوں کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے۔حفاظتی تہہ اتر جانے سے حساسیت بڑھ جاتی ہے۔گرم اور سرد اشیا تکلیف دہ محسوس ہونے لگتی ہیں۔

11۔کیلشیم کے انجذاب اور باقی میٹا بولزم میں تبدیلی کے باعث گردے کی پتھری بننے کا امکان 23 فیصد زیادہ ہو جاتا ہے۔

12۔سوڈیم بینزویٹ کی موجودگی ڈی این اے کی کارکردگی کو بھی متاثر کرتی ہے۔اس سے ہونے والے نقصانات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

13۔سوڈا مشروبات میں کوئی غذائیت سرے سے نہیں پائی جاتی۔بھوک مٹانے میں ان کوئی کردار نہیں۔ البتہ وقتی طور پر پیاس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ان کے بے پناہ نقصانات کے مقابلہ میں یہ کوئی ایسا مثبت پہلو نہیں۔یہ ایک غیر فطری چیز ہے جس کے نقصانات معمولی نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔

سوڈا مشروبات کے ان مضر اثرات کے باعث اب دنیا بھر میں ان مشروبات کی حوصلہ شکنی کے مطالبات سامنے آ رہے ہیں۔نئی دہلی کے ایک تعلیمی ادارے میں ایک ہی وقت میں بہت بڑی مقدار میں یہ مشروب پینے سے جسم میں کاربن ڈائی آکسائڈ جمع ہونے کے باعث ایک طالب علم کی موت واقع ہو گئی۔

چنانچہ یہ مطالبہ قوت پکڑ رہا ہے کہ درج ذیل اشیا کی فروخت کم از کم سکول کی کینٹین میں ممنوع کر دی جائے۔

☆سوڈا مشروبات ☆سپورٹس یا انرجی مشروبات

☆دیگر مشروبات جن میں اصل فروٹ جوس پچاس فیصد سے کم ہو اور ان میں اضافی شکر ڈالی گئی ہو۔

قوت بخش مشروبات (EnergyDrink s)

جن مشروبات کو مضر صحت پایا گیا ہے ان میں یہ بھی شامل ہیں۔انہیں سپورٹس ڈرنکس بھی کہا جاتا ہے۔یہ مشروبات عام طور پر تازہ دم رہنے اور بیدار رہنے کیلئے نوش کئے جاتے ہیں۔بعض اوقات انہیں الکوحل مشروبات میں ملا کر بھی پیا جاتا ہے۔

امریکہ میں 1999 میں 3.8 بلین ڈالر کے انرجی مشروبات استعمال کئے گئے۔2013ء میں یہ

اخراجات بڑھ کر 27.5 بلین ڈالر ہو گئے۔

یہ مشروبات استعمال کرنے والوں میں 66 فیصد افراد 13-35 سال کی عمر کے ہیں۔ ان میں 65 فیصد مرد ہیں۔

اجزاءِ ترکیبی:

ان مشروبات میں درج ذیل اہم اجزاء شامل ہیں۔ پانی، شکر، جڑی بوٹیوں کا رس، کیفین۔ ان مشروبات میں کولا مشروبات کی نسبت تین گنا کیفین موجود ہوتی ہے۔ کوکا کولا میں اگر کیفین کی مقدار 35 ملی گرام ہے تو انرجی ڈرنک میں 120 ملی گرام ہے۔ بعض مقامات پر تو یہ مقدار 300 ملی گرام تک پہنچ جاتی ہے۔

ان مشروبات میں کسی قسم کے نمکیات یا غذائی مادے شامل نہیں۔

صحت پر اثرات:

یہ مشروبات سوڈا مشروبات سے بھی زیادہ خطرناک ہیں ان کے پینے کے بعد محسوس ہونے والی تازگی حقیقی نہیں ہوتی۔

پینے والا بیدار تو رہتا ہے لیکن کام توجہ سے نہیں کر سکتا۔ وقتی تازگی اور خوشی کا احساس جلد ہی جذباتی ہیجان بے چینی، پریشانی، الجھن اور بے خوابی میں بدل جاتا ہے۔

ان مشروبات میں بھی شکر کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے خون میں شکر کی سطح برقرار رکھنے کیلئے جسم سے شکر کے ساتھ پانی بھی زیادہ خارج ہوتا ہے۔ پانی کے ایک فیصد اخراج سے جسم کی کارکردگی 10 فیصد کم ہو جاتی ہے۔ جسم پانی کی کمی (Dehydration) کا شکار ہو جاتا ہے۔

کیفین کی زیادہ مقدار کے باعث دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔ دماغ کو ضعف پہنچنے سے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ متلی اور قے بھی ہو سکتی ہے۔

ایک مقام پر ایک اٹھارہ سالہ کھلاڑی مشروب کی چار بوتلیں پینے کے بعد باسکٹ بال کھیلا اور پھر مشروب کے مضر اثرات کے سبب چند گھنٹوں میں مر گیا۔

چیچنیا میں 2012ء میں یہ مشروب پینے کے بعد ایک موت اور 530 افراد ہسپتال میں ہنگامی حالت میں داخل ہونے کے باعث ان مشروبات پر پابندی لگا دی گئی۔

ایک سکول کے پرنسپل نے 2009ء میں درخواست کی کہ ان مشروبات کی فروخت بند کی جائے کیونکہ ان

کے پینے کے بعد بچے اپنے کام پر توجہ مبذول نہیں رکھ سکتے۔

ان شکایات کے بعد اب ان مشروبات کے کین پر درج ذیل تنبیہہ لکھی ہوتی ہے۔

''ایک دن میں دو کین سے زیادہ پینا آپ کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔''

''حاملہ خواتین دودھ پلانے والی مائیں۔ سولہ سال سے کم عمر بچے دل، بلند فشار خون اور ذیابیطس کے مریض اور وہ افراد جنہیں کیفین سے الرجی ہے یہ مشروب استعمال نہ کریں۔''

''کھلاڑی ورزش کے دوران یہ مشروب مت پئیں۔''

کون سے مشروبات پیے جائیں:

موسم گرما میں بالخصوص مشروبات کی طلب بڑھ جاتی ہے گرم خشک موسم میں ہمارے ہاں صدیوں سے رائج مشروبات غذائی اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ شکر کے شربت میں ستو بہت فرحت بخش محسوس ہوتے ہیں۔

تازہ پھلوں کا رس ہر موسم میں بہت ہی صحت افزاء ہے گرمیوں میں کچے آموں کا شربت آسانی سے تیار کر کے رکھا جا سکتا ہے۔ آلو بخارے اور املی کا شربت بھی بہت عمدہ ہے بادام کا شربت گھر میں تیار کر کے استعمال کریں۔

سردائی ہمارا روایتی مشروب ہے۔ نہ صرف غذائیت سے بھرپور بلکہ قوت بخش اور ذائقہ دار ہے۔

لسی ہمارے روایتی مشروبات میں بہت اہم ہے۔ مئی جون کی گرمی کی دوپہر میں لُو کا مقابلہ کرنے میں نمکین لسی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

کسی بھی پھل کو دودھ میں ملا کر ''ملک شیک'' بنا لیں۔ نہایت ذائقہ دار اور غذائیت سے بھرپور مشروب ہے۔

ترکیب بادام کا شربت:

بادام گری	ایک کپ
چینی	پانچ کپ
پانی	ڈھائی کپ

بادام بھگو کر رکھ لیں۔ تاکہ چھلکا آسانی سے اتارا جاسکے۔ پھر انہیں باریک پیس لیں۔

پانچ کپ چینی میں ڈھائی کپ پانی ڈال کر پکائیں۔ خوشبو کے لئے سبز الائچی دانے ڈال لیں۔ جب شیرہ کی تار بن جائیں تو پسے ہوئے باداموں کی

پیسٹ ملالیں۔ایک جوش آنے پر اتار لیں۔شربت تیار ہے۔

گھر میں بنائے گئے شربت میں کسی قسم کے کیمیائی مرکبات شامل نہ کریں۔ بنا کر فریزر میں رکھ لیں تو دیر تک ٹھیک رہتے ہیں۔فریزر میں رکھنا پسند نہ ہو تو پھر بھی یہ ایک ہفتہ تک فریج میں ٹھیک رہتے ہیں۔

معلوم نہیں حقیقی قوت بخش تازہ مشروبات کو ترک کر کے ہم ایسے مشروبات کے کیوں گرویدہ ہو گئے ہیں جن کے نقصان ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔کیا ہم ان کو ترک کرنے کو تیار نہیں؟

(استفادہ:انٹرنیٹ)

☆☆☆

محسنِ بنتِ حوا

ایک ایسے دور میں جب
بیٹیاں ذلت کا باعث تھیں
چہکتی، کھیلتی اور سانس لیتی
بیٹیاں دفنائی جاتی تھیں
محمدؐ بیٹیوں سے پیار کرتے تھے،
انہیں مہرِ نبوت والے شانے پر بٹھاتے تھے
انہیں ناز و نعم سے پالتے
اخلاق اور تعلیم سے آراستہ کرتے،
کسی بھی معرکے سے لوٹتے تو
سب سے پہلے اپنی بیٹی ہی سے ملتے تھے،
وہ گھر آتیں تو اٹھ کے،
اُن کا استقبال کرتے تھے!!
اک ایسے دور میں جب
بیویاں پاؤں کی جوتی تھیں،
محمدؐ نے انہیں تعظیم اور توقیر بخشی

ان کے دکھ سکھ میں رہے شامل
خدیجہؓ کو انہوں نے محسنہ کہہ کر سراہا
عائشہؓ کی دلنوازی کی
انہوں نے بیویوں کا دھیان رکھا! مان رکھا!
اور اپنے علم اور کردار کی خُو سے
اجالا، فیض بخشا، مرتبہ بخشا!
انہیں گھر میں، وراثت میں، محبت میں
بڑا حصہ دیا!!
(محمدؐ محسنِ انسانیت ہیں،
بنتِ حوا پر بڑا احسان ہے ان کا)
محمدؐ اور ان کی آل پر
اللہ کی رحمت اور برکت ہو!!

☆☆☆

(شمیم فاطمہ)

غزل

کوئی دیوار، کوئی در نہیں بننے دیتا
اے خدا، کون مرا گھر نہیں بننے دیتا

آرزو، شوق، یہ دل، یہ آنکھیں، پھر خاک
وقت یوں میرا مقدر نہیں بننے دیتا

میرا ہمزاد بھی مائل مری تخریب پہ ہے
ٹوٹ جاؤں تو مکرر نہیں بننے دیتا

آنکھ میں ٹھہرے ہوئے خواب کی تعبیر کا خوف
اب کسی اشک کو گوہر نہیں بننے دیتا

وحشت شب میں کسی عہد گزشتہ کا خیال
شہر احساس کو کھنڈر نہیں بننے دیتا

چشم کمخواب سے بیکار الجھتا ہوا دل
کوئی ترتیب بھی شب بھر نہیں بننے دیتا

صہیب اکرام

غزل

چپ رہنا ٹک دیکھنا کچھ نہ کہنا اچھا لگتا ہے
دل ہی دل میں کڑھنا رونا ہنسنا اچھا لگتا ہے
کھوج میں جب دو چار سُکھوں کے دنیا گھوم کے تھک جائیں
دکھ گھر کی دہلیز پہ مِل کے سہنا اچھا لگتا ہے
کھلی فضا میں اڑتے پنچھی بہکی بہکی مست ہوا
پنکھ بنا ان سب کے سنگ سنگ اڑنا اچھا لگتا ہے
جگنو تتلی چاند ستارے اڑتے بادل ہنستی دھوپ
دل آنگن میں انہیں بلا کے کھیلنا اچھا لگتا ہے
ساری عمر کی دانائی کا بوجھ اتار کے کندھوں سے
ہر بچے کی نادانی سے بہلنا اچھا لگتا ہے
بغض وحسد کی آگ میں جلتی دنیا جب برسائے آگ
صبر کی ٹھنڈی موجوں کے سنگ بہنا اچھا لگتا ہے
سارے کام ادھورے چھوڑ کے نرم سنہری دھوپوں میں
بیتے وقت کی اک اک تہہ کو کھولنا اچھا لگتا ہے
شیلف پہ رکھی تصویریں جب دھیرے دھیرے بات کریں
کوئی پرانا پیاروں کا خط پڑھنا اچھا لگتا ہے
دیکھ کے اپنے بچوں کو خود اپنے میں مصروف بہت
پانی کیاری کے پھولوں کو دینا اچھا لگتا ہے

(نجمہ یاسمین یوسف)

ماں

ماں جو بھی ہے جیسی ہے ہماری ماں ہے
کالی ہے کہ گوری ہے ہماری ماں ہے
کل اپنے لڑکپن پہ لُٹا جس کا شباب
ہاں یہ وہی بوڑھی ہے ہماری ماں ہے

قسمت کی بلندی ہے ترے قدموں میں
خوشخبری عدن کی ہے ترے قدموں میں
اے ماں تری عظمت کو فضیلت کو سلام
بخشش بھی ہماری ہے ترے قدموں میں

ماں تیری محبت پہ دل و جان فدا
اخلاق و مروت پہ دل و جان فدا
نرمی پہ تری تیشۂ گل بھی صدقے
کردار کی عظمت پہ دل و جان فدا

بچہ وہی کرتا ہے جو ماں کرتی ہے
یہ بات بھی کلمے کی طرح سچی ہے
بچے کے لئے ماں کا عمل ہے حجّت
یہ رنگ یہ حرکت یہ ادا فطری ہے

ظلمت میں رہی ماں نے اجالے بانٹے
گرتے ہوئے بچوں میں سنبھالے بانٹے
دکھ درد میں شامل رہی اوروں کے بھی
بھوکے تھے پڑوسی تو نوالے بانٹے

ماں جیتی ہے کب اپنی مرادوں کے لئے
اس کی تو ہر اک سانس ہے بچوں کے لئے
بچے ہوں شکم سیر تو پیٹ اس کا بھرے
پل پل یہ تڑپ اٹھتی ہے اوروں کے لئے

دکھ ماں کا اٹھاتے نہیں ناداں بچے
جنت کا مگر کرتے ہیں ارماں بچے
جنت ہی سے کرتے ہیں یہ دوزخ سا سلوک
دن رات جلاتے ہیں دل و جاں بچے

ماں زخم پہ مرہم کی نظر کرتی ہے
اک نسخۂ پیہم سی نظر رکھتی ہے
کھلتے ہیں اسے دیکھ کے سوکھے ہوئے رُخ
یہ بچوں پہ شبنم سی نظر کرتی ہے

ماں جن کو میسر ہو وہ خوش قسمت ہیں
جن کے ہاں یہ گوہر ہو وہ خوش قسمت ہیں
جن لوگوں کی نظروں کے مقابل حافظؔ
دن رات یہ پیکر ہو وہ خوش قسمت ہیں

(حافظ کرناٹکی۔کرناٹک)

مہذب

''دوتین ہفتوں سے صبا سے بات نہیں ہوئی اللہ کرے خیریت ہی ہو۔''ابا میاں نے فکرمندی سے کہا اور ساتھ ہی فیضان دھم سے کود پڑا۔

''دادا ابا، دادا ابا! صبا پھوپھو آئی ہیں سکائپ پر، جلدی سے بات کرلیں''اسکا سانس پھول رہا تھا اور کلام میں سپر ایکسپریس کی سی تیزی تھی۔

''اے لو۔ابھی صبا کا نام لیا اور ابھی وہ سکائپ پر موجود ہے۔کچھ اور ہی مانگ لیتے۔''اماں بھی نے کھٹ سے کہا۔

چند ہی لمحوں میں دونوں بزرگ اپنے کمرے سے لاؤنج میں پہنچے جہاں اول تا آخر تمام چھوٹے بڑے صبا پھوپھو سے مذاکرات میں مصروف تھے۔ابا میاں کو دیکھتے ہی سلام دعا کے بعد صبا بولی:

''ابا میاں! فوراً سے بیشتر بوریا بستر باندھ لیں۔''

''ہائیں وہ کیوں؟''ابا میاں کو واقعی اس کی بات کی سمجھ نہ آئی اور صبا کی مسکراہٹ بھی پراسراری لگی۔

''آپ کا پاسپورٹ تو موجود ہی ہے فوراً ویزہ کے لئے اپلائی کردیں، میرے پاس آنے کے لئے ...... واپسی میں بے شک گڑیا کے پاس انگلینڈ میں قیام کرلیں۔''

''لو...... یہ کیا بات ہوئی بیٹھے بٹھائے، نہ بھئی نہ۔میں نہیں جانے کا۔''ابا میاں نے انکار کیا۔

''اُف......و......ہ...... ابا میاں آپ کی نواسی ماریہ نے پہلی پوزیشن لی ہے انٹرنیشنل سکول کے کسی بھی گریڈ میں پہلی پوزیشن لینا بہت بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔پھر سلمان کی بھی پروموشن ہوگئی ہے، ہمیں نیا گھر مل رہا ہے بہت بڑا اور کھلا۔چاروں طرف لیچی، انار کے درخت ہیں۔ماریہ کے اعزاز میں بہت بڑی تقریب ہوگی میرا دل چاہتا ہے آپ اس میں ضرور موجود ہوں۔''صبا نے اپنا پورا پروگرام گوش گزار کیا۔

''سوچوں گا......ویسے لمبے بکھیڑوں سے او را ایمبسی والوں کی ذلالت سے ڈر ہی لگتا ہے بہت خواری ہوتی ہے۔''ابا میاں کچھ کچھ آمادہ تھے مگر خدشات کے ساتھ۔

صبا بے ساختہ ہنسی''ابا میاں خواری کیسی؟ امریکہ کی حکومت کی یہی ایک خوبی سب پہ بھاری ہے کہ وہ

اولڈ سٹیزن اور بچوں کو خصوصی مراعات دیتی ہے......
ادھر آپ اپلائی کریں گے ادھر ایمبسی سے بلاوہ آ جائے گا۔''

''اے لو، خاک توجہ دیتی ہے تمہاری حکومت......
مجھے یاد نہیں تمہارا محسن چھ گھنٹوں کا تھا جب ہسپتال سے گھر لے کر گئے تھے تم سارے راستے گود میں نہ لے سکی تھیں وہی نگوڑ ماری بچوں کی بیلٹ والی کرسی پر لٹا کر لے گئے تھے۔''اماں ابھی تک وہ واقعہ نہ بھولی تھیں۔

''دادی بی...... انگور کھٹے ہیں۔'' فیضان نے دادی بی کی شوگر اور بینائی کی کمی کی وجہ سے نہ جا سکنے پر تبصرہ کیا۔

''اے...... واہ...... میں کیوں جاؤں اس موئے خنزیر کھانے والوں کے ملک میں، نہ بابا نہ۔'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

صبا پھر مخاطب ہوئی۔'' ابا میاں! اگر آپ نے انکار کیا تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ بھلے دو ماہ کے لئے آئیں آنا ضرور ہے......''اس نے دھمکی والے انداز میں کہا۔ پھر وہ چہکتے ہوئے بولی ۔'' آپ جب آئیں گے تو اپنے حلقہ احباب کو بلاؤں گی کھانے پر، میں نے تو اسلامک سنٹر والوں سے وقت بھی لے لیا ہے۔''

''اچھا بھئی تم مجبور کرتی ہو تو اپلائی کر دیتا ہوں۔'' سدا کے سیلانی مزاج ابا میاں نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔

''ابا میاں زندہ باد۔ ہم آپ کو نیویارک، نیوجرسی اورفلوریڈا کی سیر کروائیں گے۔''صبا بچوں کی طرح خوش تھی۔

''ہپی اینڈ بھئی ہپی اینڈ۔'' فیضان تبصرہ کرنے سے باز نہ آیا۔

ابا میاں کو ویزہ کے لیے اپلائی کرنے کا غذات او کے ہونے، امریکہ جانے اور واپس آنے میں چار ماہ اور پچیس دن لگے۔ واپسی میں انگلینڈ کی برف باری بوڑھی ہڈیوں سے برداشت نہ ہوئی اور سینے میں انفیکشن اتنا شدید ہوا کہ واپس آتے ہی بنی، ورنہ شاید انگلینڈ میں ہی بیٹے کے ہاں ڈیرہ ڈال لیتے۔ اماں بی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ فون کال کے شروع میں ہی حملہ آور ہو جاتیں۔

''کیا تابوت میں آئیں گے۔ یا پھر ہنستے ہوئے آنے کا ارادہ ہے۔''

جس دن ابا میاں واپس آئے گاڑیوں کا ایک

کاروان ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

گھر کے داخلی دروازے کے قریب ہی کیلے کا چھلکا پڑا ہوا تھا جس پر سے ابا میاں پھسلتے پھسلتے بچے۔

''لاحول ولا قوۃ...... یہ کیا جہالت ہے پاگل لوگ......''سخت لہجے میں ابا میاں نے کہا،سب مسکرائے۔''امریکہ یاترا'' کا رنگ خوب چڑھا ہوا تھا اتنی بیماری اور لمبے سفر کی مشقت کے باوجود بہت سرخ وسفید لگ رہے تھے۔اماں بی نے علی الاعلان کہہ دیا۔

''اے یہ ڈبوں کا دودھ اور جوس پی پی کر خوب جان بنائی ہے تم نے۔''اگلے دوتین دن جو بھی ملنے آتا رہا ابا میاں کے پاس موضوع گفتگو ایک ہی ہوتا۔وہاں کے لوگ۔ان کی اصول پسندی،ان کی انسان دوستی، ان کی صفائی ستھرائی۔

ابا میاں کے بڑے بھائی نے دعوت کی تو سارا گھرانہ وہاں جانے کو تیار۔انہوں نے نو بجے پہنچنے کی تاکید کی تھی ادھر یہ حال کہ چھ گھنٹے سے بجلی غائب کپڑے کیسے استری ہوتے۔جنریٹر چلانا چاہا تو سوئی گیس رویت ہلال کمیٹی کا چاند بنی ہوئی تھی۔اللہ اللہ کر کے بجلی آئی۔ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلے تو لگتا تھا سارا شہر بڑے ابا کے گھر مدعو ہے۔ہر گاڑی کا رخ کلمہ چوک کی طرف۔

ٹریفک کا اژدھام ، بے ہنگم موسیقی، ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی گاڑیاں،ہارن۔

ابا میاں گرج کر بولے:

''اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے کوئی قانون نہ اس کی پیروی۔آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ارے امریکہ جا کر دیکھو سڑک گاڑیوں سے بھری ہوتی ہے لیکن چاروں جانب خاموشی۔امریکہ کے صدر کی بیٹی بھی خلاف ورزی کرے تو پکڑی جائے۔ اور یہ ڈرائیور......گنوار......بدتہذیب،کس طرح حلق پھاڑ کر چیخ رہے ہیں،جانور کہیں کے......

''دادا ابا...... یہ اوول کہاں ہے؟ کیا آپ وہاں بھی گئے تھے۔''فیضان نے حکمت سے موضوع بدلا۔

''او......ول...... بیٹا۔جانے کی خواہش تو بہت تھی پر تمہاری گڑیا چچی نے بھی نہ جانے دیا کہ پہلے ہی لندن کے لئے ایک ہفتہ لے کر آئے ہیں اس میں بھی اگر اوول کا رخ کر لیا تو ہمارے لیے کیا بچے گا! خوب گھمایا پھرایا تمہارے شانی چچا نے۔دریائے ٹیمز تک دکھا دیا۔

ان کے دوستوں نے خوب دعوتیں کیں۔دعوتیں کھا کھا کر تھک گیا ورنہ ضرور جاتا۔وہاں کا کرکٹ پلے

گراؤنڈ پوری دنیا میں مشہور ہے بلکہ آج کل تو وہاں میچ بھی ہو رہا ہے۔ وہ گڑیا کا چھوٹا بیٹا کیا ہے نام ہے اس کا...... امتحان ...... نہیں نہیں کچھ اور تھا...... ہاں امتنان، وہ بھی تو سارا دن کرکٹ میچ ہی دیکھتا رہتا تھا۔''

ٹریفک لمحاتی اذیت کے بعد پھر رواں دواں تھی۔ بڑے ابا کا گھر بس پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا جب فیضان کو پھر کھجلی ہوئی بولا:

''دادا ابا! اوول میں جو کرکٹ سیریز چل رہی تھی آپ کو پتہ ہے کل ختم ہو گئی ہے!''

''ہاں پتہ ہے اور شاید انگلینڈ نے جیتی ہے۔ ہار جیت تو چلتی رہتی ہے۔'' ابا میاں نے گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں دادا ابا یہ سیریز انگلینڈ نے مسلسل تیسری دفعہ جیتی ہے۔ ہیٹ ٹرک ہو گئی ان کے جیتنے کی۔''

''واہ بھئی، یہ تو مجھے علم نہیں تھا۔'' دادا ابا پرجوش ہو گئے۔

''اور آپ کو پتہ ہے جیتنے کے بعد ان گوروں نے کیا کیا۔'' فیضان کا لہجہ کچھ اور طرح کا تھا۔

''بھئی گورے تو ویسے ہی بڑے کھلے ڈلے ہوتے ہیں، شراب پی ہو گی، ناچے ہوں گے، خوب ادھم مچائی ہو گی۔'' دادا ابا بولے۔

''نہیں دادا ابا! یہ سب کچھ تو وہ ہر دفعہ کرتے ہی ہیں اس کے علاوہ انہوں نے ایک کام اور کیا تھا جو کبھی انسانی تاریخ میں نہیں ہوا۔ ان کے اپنے نشریاتی اداروں نے بھی اس ''کارخیر'' کا ذکر کیا۔ اخبارات میں پوری تفصیل آئی ہے، یہ دیکھئے۔'' اس نے انگلی اپنے موبائل کی سکرین پر رکھی جہاں aps کے ذریعے تازہ اخبار میں چھپی ہوئی تصویر کا کلوز اپ میسر تھا۔

دادا ابا نے فون ہاتھ میں لیا، تصویر پر نظر ڈالی اور فوراً نظر پرے کر لی۔

''دادا ابا! دیکھا آپ نے۔'' فیضان کراہت سے بولا'' کتنے مہذب اور اصول پسند ہیں گورے۔ شراب پی کر میدان میں ہی پچ کے اوپر کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے ہیں۔ اور ...... اور اس کام کی لائیو کوریج کی پروا بھی نہ کی ان مہذب لوگوں نے۔ یہ دیکھئے سٹوارٹ براڈ، کیون پیٹرسن اور جیمز اینڈرسن کھڑے ہو کر کیا کر رہے ہیں۔''

''اُف...... گن...... دے......'' گاڑی میں موجود سارے افراد چیخے۔

ابا میاں چپ تھے...... گہری سوچ میں گم!

☆☆☆

من کا پاپ

تریا، راج اور بالک کی ہٹ یوں ہی تو مشہور نہیں ہوگئی۔ بس آج خواہ مخواہ ہی ضد آ گئی تھی مجھے کہ یہاں نماز پڑھنا ہے۔ اور مسجد کے منتظم نوجوان کا رویہ مجھ سے تلخ سے تلخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے خلاف توقع دیر ہوگئی۔ ظہر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ بازار میں ایک جانب چھوٹی سی مسجد نظر آئی تو جلدی سے بہن کے ہمراہ مسجد کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ ایک کمرے کی مسجد تھی جس کے باہر ایک نوجوان عطر، مسواک، ٹوپیاں اور دعاؤں کی کتابیں لیے بیٹھا تھا۔ مسجد کے شیشے کے دروازے تھے انتہائی نفیس، صفیں بچھی ہوئی تھیں اور شیشوں کا انتہائی عمدہ کام تھا دیواروں پر۔ مشکل سے 80 گز کے احاطے پر ہوگی مسجد...... انتہائی صاف ستھری۔ سیڑھیوں پر بھی نفیس ٹائلز لگے ہوئے سیاہ رنگ کے۔ کیا تھا اگر میں داخل ہوجاتی مسجد میں۔ مگر وہ متولی بضد تھا کہ مسجد عورتوں کے لئے نہیں ہے۔ آپ قریبی کسی عزیز کے گھر میں جا کر نماز پڑھ لیں۔ میں نے کہا اگر عزیز کا گھر ہوتا تو تمہارا وقت کیوں ضائع کرتی؟

بولا ’’ آج تک کوئی عورت نہیں گئی اس مسجد میں۔‘‘

میں نے کہا ’’ آج میں جاؤں گی۔ کیا تمہیں میرے مسلمان ہونے پر شک ہے؟ ہے تو بتاؤ......‘‘ میرے ساتھ تو بچے بھی نہیں کہ تمہیں گندگی کا خطرہ ہو۔ سنو کیا ایک مسلمان عورت نجس ہے جو اللہ کے گھر میں نہیں جا سکتی؟ میں کلمہ گو ہوں تمہیں کیوں شک ہے مجھ پر۔ جب اللہ کے نبیؐ نے منع نہیں کیا تو تم کون ہوتے ہو مجھے اللہ کے گھر سے روکنے والے۔ اللہ کی زمین پوری مسجد ہے، سب کے لئے ہے۔ تمہارے پاس اختیار ہے تو اس کا ناجائز فائدہ کیوں اٹھاتے ہو؟ میں تمہیں مسجد میں نماز پڑھ کے دکھاؤں گی۔ بس 5 منٹ مجھے جانے دو میں فرض پڑھ کر آ جاتی ہوں!‘‘

وہ میرے لب و لہجے سے بھانپ گیا تھا کہ اسکی نہیں گلنے والی۔ سو اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اور بولا:

''جلدی آؤ واپس۔''

میں نے کہا ''اس وقت کون آئے گا مسجد میں...... ابھی تو عصر میں وقت ہے۔''

یہ کہہ کر میں لپک کر مسجد میں داخل ہوئی اور فرائض ادا کیے۔ لیکن اتنا تضحیک آمیز رویہ تھا اس نوجوان کا کہ دل پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ ایک کمرے کی مختصر مسجد۔ مگر چھت سے لے کر دیواریں اور صفیں سب حسنِ ترتیب کا شاہکار۔ عطر کی خوشبوؤں میں بسی مسجد۔ وضوخانہ اور چھوٹا سا صحن بھی تازہ دھلا ہوا لگ رہا تھا۔ نفل بھی نہ پڑھے کہ وعدہ خلافی ہو جائیگی۔ اس بھرے بازار میں یہ گوشہ کتنا مختلف تھا۔ کتنا پرسکون، کتنا نفیس...... حقیقتاً جی نہ چاہتا تھا کہ جلدی سے نکل آؤں اس لیے کہ باہر تو وہی بازار کی بھیڑ بھاڑ!! خیر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر بازار میں آ گئی۔

یہ کراچی کے قدیم ترین بازاروں میں سے ایک بازار ہے۔ بازار میں انتہائی دائیں جانب سرکس لگا ہوا تھا۔ سالانہ سرکس جو یہاں لگتا ہے۔ دوطرفہ سڑک پر ٹریفک کا ہجوم۔ بسوں سے تیز تیز آتی ریکارڈنگ کی آوازیں۔ بازار کی راہداریاں جہاں کھوئے سے کھوا چھلتا ہے۔ یوں ہی تو نبی پاکؐ نے بازاروں کو ''بری گزرگاہیں'' نہیں کہا ناں......اور بھی بہت کچھ فتنے یہاں ہوتے ہونگے جن میں سے کچھ ہمیں نظر آتے ہیں اور کچھ ہماری نظروں سے اوجھل۔ بہرحال جتنا دھوکہ، بے ایمانی بازاروں میں ہوتی ہے۔ شاید ہی کہیں ہوتی ہو! بچپن میں ضرورت کی ہر چیز بھائی اور امی لا دیا کرتے تھے۔ جب شوہر کو علم ہوا کہ بازار سے الرجی ہے مجھے تو وہ یہ فریضہ انجام دینے لگے اور میں انتہائی ناگزیز حالات میں ہی نکلتی ہوں اس ''بری گزرگاہ'' کی جانب۔

لیکن اس مسجد کے منتظم کی بات کے بعد قطعاً دل نہ لگا بازار میں۔ سرکس کی وجہ سے بھی رش بہت تھا۔ لیکن جس علاقے میں سرکس ہو رہا تھا اور عورتوں کی نیم برہنہ تصویریں سرکس کے پنڈال میں اندر باہر لگی تھیں وہاں تو شرفا جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سرکس کے ماحول صاف ستھرے کیوں نہیں ہوتے؟ یہ سوال بچپن سے آج تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ کیا اس مہذب اور شائستہ ماحول میں یہ تفریح فراہم نہیں کی جاسکتی؟ لیکن پھر شاید وہ ''سرکس'' ہی نہ ہو!

اس بازار میں انتہائی عقبی حصے میں ایک سینما گھر بھی ہے۔ ہمارے بچپن میں تو شاید ہی پوری بستی کا کوئی

گھر ہو جونئ فلم کا انتظار نہ کرتا ہو۔ اور لوگ جمعہ کے مبارک دن کا انتظار کرتے تھے نئ فلم کے افتتاح کے انتظار میں۔ کیوں کہ سب نئ فلموں کا آغاز ''جمعہ کے مبارک دن'' سے ہوتا تھا اور پہلا شو کھڑ کی توڑ ہوتا تھا جس کے لئے کئ دن قبل بکنگ کرانا پڑتی تھی۔ پھر ''اسٹار پلس'' اور ''زی ٹی وی'' آنے سے سینما ہال سونے ہوگئے۔مگر یہاں اب بھی پشتو اور پنجابی فلمیں لگتی ہیں۔سینما گھر کی طرف نظر اٹھی اور فوراًہی جھک گئ کہ انتہائی عریاں سائن بورڈ لگے تھے کسی فلم کے۔

میں نامکمل خریداری کے ساتھ ہی واپس آکر گاڑی میں بیٹھ گئی...... میں نے بہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کتنا بوجھل ہوگیا دل مسجد کے منتظم کے رویے سے۔مگر ہم سب حقیقتاً اپنی ذات میں مسجدوں کے متولی ہیں۔اس سوگز زمین کے باہر اس کو پروا ہی نہیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔اس کی ذمہ داری بس اس محدود احاطے تک محدود ہے۔گویا یہ پوری زمین تو تھی ہی اس لیے کہ اسے فتنوں اور فساد سے بھر دیں۔مسجد کے عقب میں سرکس کے نام پر بے ہودگیاں ہوتی رہیں......بسوں میں ناگوار ریکارڈنگ یا سینما گھر میں مخرب اخلاق فلمیں چلتی رہیں۔بازاروں میں دھوکے فریب کا کاروبار ہوتا رہے، چور بازاری اور لوٹ مار چلتی رہے......مسجد کا متولی کتنا مطمئن اور مسرور ہے اپنی جنت پکی کر کے۔اس کے تقویٰ کا معیار یہ ہے کہ مسجد انتہائی صاف اور خوشبوؤں میں بسی رہے۔نمازی آئیں یا نہ آئیں اس کو کیا غرض! ایک عورت مسجد میں چلی جائے گی تو اس کے خیال میں مسجد کی حرمت پامال ہوجائے گی۔لیکن بازار کی باقی دنیا میں اللہ پاک کی سب اصلی حدیں ٹوٹ رہی ہیں اس سے اس بے چارے کو کیا غرض۔

یہی حال ہم سب کا ہے۔ہم مسجد کے متولی کی طرح اپنی جنت، اپنے تقویٰ کے خول میں بند ہیں کہ یہ خوشبو اور صفائی ہمیں ٹھنڈی سڑک سے جنت تک لے جائے گی۔اللہ کی تو ساری زمین ہی مسجد ہے۔اس مسجد کی صفائی ستھرائی......اسے خوشبوؤں میں بسانے کی فکر کون کرے گا؟ مسجدوں کی طرف نمازی آئیں، ہم سب کے گھروں کے دروازے فجر میں وا ہوں، ہر گھر سے نمازی نکلیں، یہ مسجدیں آباد ہوں۔مگر مسجدیں بنانے والے تو اس فکر سے بے نیاز ہیں۔ہم انتہائی عالیشان مسجدیں بنا کر، قرآن کے درجنوں نسخے رکھوا کر، بہترین امام کا بندوبست کر کے مطمئن ہوجاتے

ہیں۔ وہ جو وقت کے امام ہوں جو مسجد کی طرح مقدس سمجھیں اس سرزمین کو...... کہ اس کا ہر چپہ مسجد جیسا مقدس ہے۔لیکن ہم نے اس تقدس کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہر اک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے جنت کے شارٹ کٹ کی تلاش میں ہے۔

اور یہ پاک سرزمین پکار رہی ہے کہ اسکو پاک کرنا تو ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی!!

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

قطرہ قطرہ شبنم

والد دنیا سے کیا رخصت ہوئے اپنوں نے بھی نظریں پھیرلیں۔ ماموں وقار اکبر ایک رات رُک گئے کہ کل صبح مسجد میں قل ہیں گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ البتہ ممانی اور بچے جنازہ اٹھتے ہی چلے گئے تھے۔

ایک دور کے چچا تھے۔ وہ قبرستان سے ہی واپس نہ آئے باقی چند محلے کے لوگ اور کچھ ابا جان کے دفتر کے ساتھی کچھ نماز کے ساتھی تھے۔

رات گئے گلی کی نکڑ والے پکے مکان سے شیخ انور صاحب نے کھانا بجھوایا۔

نائلہ نے شمائلہ اور لیلیٰ کو زبردستی کھانا کھلایا۔ ماموں کو کھانا دے دیا۔ لیلیٰ کے آنسو کسی طور نہیں تھم رہے تھے۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ اسے تو ماں کی شکل بھی یاد نہیں تھی۔ نائلہ بڑی تھی اس نے زمانے کا سرد گرم کافی دیکھ لیا تھا۔ اس نے کہا کہ آنسو بہانے کیلئے تمام عمر پڑی ہے۔ اس وقت اپنے آپ کو سنبھالو اس شبنم کو تو قطرہ قطرہ بہنا ہی ہے۔ لیکن زخم بھرنے میں دیر تو لگتی ہے۔ بے شک باپ بیمار تھا کافی عرصے سے صاحب فراش بھی...... دو بڑی بہنیں ملازمت کر رہی تھیں۔ لیلیٰ یونیورسٹی میں تھی لیکن گھر آ کر وہ بھی ٹیوشن پڑھاتی اس طرح گزارا ہو رہا تھا۔

توقیر حیدر بستر پر لیٹے لیٹے سوچ میں گم رہتے۔ میری آنکھ بند ہونے کے بعد یہ کیا کرینگی؟ یہ تو ان کی شادی کی عمریں تھیں۔

یہ پڑھی لکھی، خوبصورت، سلیقہ شعار...... ہاں مالدار نہیں ہیں۔

بس مال کی کمی تھی۔ اول تو کوئی رشتہ آتا ہی نہیں تھا۔ مگر کوئی آیا بھی تو ایک دفعہ کے بعد لوٹ کر نہ آیا۔

وہ شروع سے کتاب زندگی کو پڑھنا شروع کرتے۔ گاؤں سے شہر آنا ان کی زندگی کا سب بڑا واقعہ تھا، شہر اتنا بڑا ہوتا ہے۔ لوگ ہی لوگ، بازار بھرے ہوئے، اتنی گاڑیاں......اور سب لوگ بھاگ رہے ہیں۔ شاید ان سب کو جلدی ہے۔ اس کے رشتے کے چچا از راہ ہمدردی اسے ساتھ لے آئے تھے کہ پڑھ لے گا۔ اصل میں وہ مسقط میں رہتے تھے۔ گھر میں

انہیں کوئی اعتبار والا ملازم چاہیے تھا۔سکول میں انہوں نے داخل کروا دیا لیکن چند دنوں میں ہی احساس ہو گیا کہ یہ صلہ رحمی کے نام پر اپنی ضروریات کا سودا ہے۔ پیچھے کون تھا۔ ایک بوڑھی نانی جس کو کم دکھائی دیتا تھا۔اس کے ہاتھ بھی کانپتے تھے۔اور لاٹھی ٹیک کر چلتی تھی۔توقیر ممانی کے سارے کام توجہ سے بھاگ بھاگ کر کرتا۔ چند دنوں کے بعد چچا مسقط پرواز کر گئے۔ اب چچی نے کہا تم مجھے بیگم صاحب کہا کرو۔

لیکن اتنی مہربانی جاری رکھی کہ سکول جانے دیا۔ چچا تین سال بعد آئے اس دفعہ ویزا مل گیا تھا۔ان کا خیال تھا کہ اپنی فیملی کو ساتھ لے جائیں گے۔لیکن توقیر...... ایک بڑا سوالیہ نشان۔گاؤں میں نانی فوت ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست رفیق سے بات کی۔اس نے کہا فکر نہ کرو۔یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا اور اس پر خرچ کرنا عین عبادت ہے۔ مجھے یہ سعادت ملے تو اور خدا سے کیا مانگوں۔ وہ غیر تھا۔ خون کا رشتے دار نہیں تھا۔ یہ رفیق صاحب کے گھر منتقل ہو گیا۔وہ اس کی زندگی کے خوبصورت دن تھے۔اپنے بچوں سے پہلے کھانا کھلاتے۔بہترین سکول اور لباس، چند ماہ میں توقیر نے قد نکال لیا۔ پڑھائی میں اول کھیلوں میں اول، تقریر اور تحریر میں اول۔انکا ارادہ تھا کہ توقیر آرمی میں چلا جائے لیکن اس کو لٹریچر پسند تھا۔وہ کہانیاں لکھنا چاہتا تھا، رائٹر بننا چاہتا تھا۔

لیکن خود ہی کہانی بن گیا۔

وہ بی اے کے بعد کمیشن کیلئے اپلائی کرنا چاہتا تھا لیکن رفیق صاحب ایک حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا بیٹھے۔اپنے محسن کو بیساکھیوں پر دیکھ کر توقیر کا دل ڈوب جاتا۔اس نے پرائیویٹ امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور نوکری کر لی۔اب اس گھر کی کشتی اس کے ذمے تھی۔

انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنی اکلوتی بیٹی ناہید کی شادی تم سے کر دوں۔ یہ انکا ایک اور احسان تھا کہ انہوں نے اسے صاحب خانہ بنا دیا۔

ان کے خیالات کا قافلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ نائلہ نے آ کر کہا۔

ابا جان! دوائی کا وقت ہو گیا ہے، لے لیں۔

اس نے سوچا دوا کا وقت تو کب کا گزر گیا۔اب تو دعا ہے جو سوچ کے ساتھ ساتھ بارگاہ ایزدی میں دستک دیتی رہتی ہے۔لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ چار گولیاں نگل لیں۔ ایک اینٹی بائیوٹک، ایک بلڈ پریشر اور دو شوگر کیلئے...... حال غریبوں والا اور بیماریاں

امیروں والی۔

شمائلہ سکول کی کاپیاں چیک کررہی تھی۔اس نے بڑی بہن کو بتایا کہ اس کی کلاس میں ایک بچہ ہے سلمان اس کی خالہ آئی تھی وہ ہمارے گھر آنا چاہتی ہے۔کیا جواب دوں؟ نائلہ کی پلکوں پر ٹھٹھرتے خواب...... دل میں آرزؤں کا ایک بے تاب سمندر اور ذہن میں گھر کے حالات گڈ مڈ ہو گئے۔

''اتوار کو بلالو۔''اس نے مختصر جواب دیا اور رات کے کھانے کیلئے کچن میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں لیلیٰ بھی آ گئی۔

''آپی کیا پکا ہے؟''

''مسور کی دال۔''

''یہ دال کی گردان کب ختم ہوگی۔تین دنوں سے دال ہی پک رہی ہے۔''

''بس گڑیا میں بازار نہیں جا سکی۔کل ان شاء اللہ کریلے قیمہ پکاؤں گی۔''

''تھنک یو باجی......چلو آج دال ہی سہی۔بسم اللہ کرتے ہیں۔لو یہ ابا جان کو دے آؤ؟''

اتوار کو مہمان آئے۔شمائلہ تو انہیں بہت پسند تھی۔لیکن خاندانی بیک گراؤنڈ کچھ قابل فخر نہ تھی۔لہٰذا پھر آنے کا وعدہ کر کے وہ لوٹ گئے۔

توقیر نے کھانے کے بعد سوچا۔

وہاں سے سلسلہ جوڑوں جہاں کل شام ٹوٹا تھا

مگر کوئی یہ تو بتلائے کہ کس کا جام ٹوٹا تھا

وہ ماضی سے نظریں چرانے لگا۔جب دیکھو یہی کھڑکی کھل جاتی ہے۔گزرے ہوئے شب وروز کی فلم...... جب سامنے کچھ دکھائی نہ دے ایک سیاہ دیوار ہو اور نوشتہ دیوار پڑھ نہ پائے تو کیا کرے۔نہ ماضی قابل فخر، نہ حال اطمینان بخش، نہ مستقبل کی شاخ امید سرسبز۔مگر پھر بھی جینا لازم ہے۔جیئے ہی جانا ہے۔یہ کیسی بے بسی ہے، ساری زندگی وہ یہی سوچتا رہا کہ محنت اور اخلاص......صداقت اور نرمی...... تقدیر بدل دے گی۔

جب یہ بیٹیاں زندگی میں آئیں تو ارمانوں کی ایک دنیا آپ سے آپ آباد ہوگئی۔اور ناہید نے منہ کیا موڑا...... سارا چمن اجڑ کر رہ گیا۔آخر یہ مرد اور عورت کا کیسا رشتہ ہے۔ایک کے چلے جانے سے دل کیسا ویران ہو جاتا ہے۔نہ کوئی پوچھے نہ بتا سکوں۔

ناہید زندہ تھی تو خوشی آباد تھی۔ پھر نیند نے آ کر اسے بے ربط سوچوں سے نجات دلا دی۔ بیٹیوں کے لیے اس کا یہ وجود ایک نعمت تھی کہ سر پر باپ موجود تھا۔ پہلے مسجد جاتا تو محلے والوں سے ملاقات ہو جاتی۔ اب تو لیٹے لیٹے ہی نماز ادا ہو جاتی تو شکرانہ ادا کرتا۔

ہفتے میں ایک آدھ بار شیخ انور صاحب حال پوچھنے آ جاتے، اب کے وہ آئے تو توقیر نے ہمت جمع کی اور کہا ''شیخ صاحب! کوئی رشتہ آپ کی نظر میں ہو تو بتائیے گا۔ میری بیماری تو جان لیوا معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنی زندگی میں ان کے ہاتھ پیلے کر دوں، آپ کو کاروبار کے سلسلے میں بہت سے لوگ ملتے ہیں۔''

انہوں نے نظریں جھکا لیں کچھ جواب نہ دیا۔

بات بھی کھوئی التجا کر کے

''اچھا...... میں کوشش کروں گا'' وہ کافی دیر بعد بولے۔ اور جانے کی اجازت چاہی۔ توقیر نے سوچا ایک بوڑھے بیمار اور بستر مرگ پر پڑے پڑوسی سے انہیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہونگے جنہیں ضرورتوں نے گھیر رکھا ہو گا۔ کیا اتنی بڑی دنیا میں کوئی کسی کے لئے اللہ کی خاطر ایثار یا احسان نہیں کر سکتا۔ میرے مولا یہ تیری کائنات کیسی ہے؟ تو اس کا مالک ہے، خالق ہے، پالن ہار ہے، تو ہی اس کو چلا رہا ہے۔ میری آنکھیں کھلی ہوں یا بند...... کسی کو کیا فرق پڑے گا۔ اس نے سوچا۔ اس کے دل نے کہا۔ نہیں تیری اولاد کو ضرور فرق پڑے گا۔ ان کا تو تم سہارا ہو۔ وہ مسکرایا۔ سہارا...... جو خود ان کے سہارے کا محتاج ہے۔ کہ کما کر لائیں، خرید کر لائیں، پکا کر کھلائیں، دوائی دیں، میں تو الٹا ان کیلئے بوجھ ہوں۔ لیکن میرے اختیار میں کیا ہے...... کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں دعا کر سکتا ہوں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا یا سنا تھا۔ باپ کی دعا پیغمبر کی دعا جیسی ہوتی ہے۔

اس نے دعائیں شروع کر دیں۔ حضرت یونسؑ کی دعا۔ حضرت ایوبؑ کی دعا۔ حضرت آدمؑ کی دعا۔ حضرت موسیٰؑ کی دعا۔ حضرت نوحؑ کی دعا۔ اسے یوں لگا جیسے ناامیدی اور مایوسی کے بادل چھٹ رہے ہوں۔ دل کو سکون سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے ہمت کی اور اٹھ بیٹھا۔ دن کا وقت تھا۔ دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چل کر صحن میں پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔ پھر ہمت کی اور صحن کا ایک اور چکر لگایا۔ آج کھانسی بھی کم تھی۔ دل میں عجیب سی امنگ تھی کہ وہ کچن میں جائے اور اپنے کے لئے چائے بنائے جب اس نے یہ کام بھی کر لیا تو

چائے بہت مزیدار لگی۔ کتنے عرصے بعد اس نے بستر کو چھوڑا تھا۔ واہ میرے مولا......تو ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور ہم...... تجھے یاد ہی نہیں کرتے۔ قصور تو ہمارا ہے۔

دو دن بعد لیلیٰ نے بتایا ''آپی میری کلاس میں ایک لڑکا ہے نعیم کانجو...... وہ بہت ہی لائق ہے۔ اور بہت ہی اچھا ہے یہ دیکھیں اس کی لکھائی کتنی خوبصورت ہے میں اسکے نوٹس مانگ کر لائی ہوں۔ بہت امیر ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے کسی گاؤں سے آیا ہے۔ ہوسٹل میں رہتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے میرے والدین خاندان سے باہر شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔'' نائلہ نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور لہجے میں بلا کے جذبے کھنک رہے تھے۔

''اچھا......تم نے یہ بھی پوچھ لیا ہے۔ کب سے اسے جانتی ہو؟''

''وہ جب سے آیا ہے مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ ملیں گی تو آپ کو بھی پسند آئے گا۔''

''گڑیا! مسئلہ یہ نہیں ہے، تم اسے کتنی اچھی لگتی ہو یہ بتاؤ۔''

''میں نے پوچھا نہیں......'' وہ چہک کر بولی۔

''جو کام کی بات ہے وہ نہ کی باقی سب کچھ پوچھ لیا۔ اچھا اسے اس اتوار کو بلا لو۔''

''ہائے آپی تم کتنی اچھی ہو۔'' اس نے پیار سے نائلہ کو گلے لگا لیا۔

اس نے بہت اصرار کیا لیکن نعیم نہ مانا پہلے کہتا رہا مجھے شرم آتی ہے۔ پھر بولا ''میرے والد صاحب بہت سخت ہیں وہ کبھی میری شادی میری پسند سے اور خاندان سے باہر نہیں کرینگے۔ میں تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کیوں امید دلاؤں۔''

لیلیٰ نے کہا ''میرے ابا جان بہت بیمار ہیں۔ تم ان کی عیادت کرنے ہی چلے آؤ۔ میں نے آپی سے وعدہ کیا تھا کہ تم آؤ گے۔ آج میرے ساتھ چلے چلو۔''

اس کے آنسوؤں نے اسے پگھلا دیا۔ وہ مان گیا۔ آگ اور تیل کی کیا دوستی...... پاس رکھو گے تو کبھی نہ کبھی تیل شعلہ بن جائیگا۔

وہ چلا آیا۔ تھوڑی دیر ابا جان کے پاس بیٹھا۔ آپی نے چائے کے ساتھ پکوڑے بنا کر بھیجے۔

اس نے کوئی بات نہ کی۔ نائلہ کو اندازہ ہو گیا کہ اسے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ اس نے سمجھانے کی

کوشش کی۔لیکن لیلیٰ ماننے کو تیار نہ تھی۔اس نے صاف کہا

''آپی! مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔''اس نے رو رو کر دعا مانگی۔میرے اللہ جی لیلیٰ کو ہدایت دے اسے نفس کے شر سے بچا۔

اور پھر توقیر ایک دن چپ چاپ بیٹیوں کو وقت کے ہاتھ میں دے کر اپنی اصلی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔جہاں سب کو ایک دن جانا ہے۔

اب سارے مسائل نائلہ کیلئے تھے۔شمائلہ کیلئے رشتہ تلاش کرنا، اس کی شادی کرنا اور لیلیٰ کو بھٹکنے سے بچانا......اپنی ذات تو کہیں دور خلاؤں میں کھوگئی تھی۔ ناہید کے دنیا سے جاتے ہی اس نے ماں کا رول سنبھال لیا تھا۔اور اب تو ماں بھی تھی اور باپ بھی......

اس کی ساتھی ٹیچر فرخندہ اس کی دوست تھی وہ اسے یاد لاتی کہ تم 35 سال کی ہونے والی ہو۔اپنے بارے میں سوچو، ایک رشتہ ہے میجر ہے، بیوی فوت ہوگئی ہے دو بچے ہیں۔اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔''میں پہلے بھی تو دو بچے پال رہی ہوں۔انہیں کس کے حوالے کرکے جاؤں۔میں اتنی خودغرض کیسے ہوسکتی ہوں۔''

''میں نے تمہاری ہمدردی کی تھی۔آگے تمہاری مرضی۔''

''چلو شمائلہ کا رشتہ دیدو۔''

''اس نے پہلے کونسی خوشی دیکھی ہے جو آگے جا کر سوتیلے بچوں کا عذاب بھگتے۔''

''توبہ ہے تم کاٹ کھانے کو تیار ہو۔نہ کرو ہمیں کیا۔''

لوگوں کی نظریں، باتیں، سوال طنزیہ رویے......
باڈی لینگویج اسے قدم قدم پر اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتی۔لیکن جینا تو ہے......

وہ سوچتی لوگ اتنے باریک بین اور باخبر ہوتے ہیں دوسروں کے بارے میں کہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔کاش اگر اس سے آدھی توانائی اور وقت ہم دوسروں کے مسائل حل کرنے پر لگا دیں تو یہ کلچر ہی ختم ہوجائے۔محرومیاں کیوں جنم لیتی ہیں ہم دوسروں کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔حادثے کیوں رونما ہوتے ہیں، ہماری لاپروائی سے، بے حسی سے، خودغرضی سے!

؎ وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

کیا میں یہ کلچر بدل سکتی ہوں، مگر کیسے......شاید جو لوگ محروم نہیں ہوتے انہیں احساس نہیں ہوتا، میں بھی سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتی تو مجھے کیا معلوم ہوتا، ان گلیوں میں کیسی حسرتیں ہیں، ناامیدی اور تنہائی کا بسیرا ہے۔ پوش آبادیوں میں تو لوگ مزے سے بنگلوں میں رہ رہے ہیں۔ وہ ناکامی کو کامیابی سے بدلنے کا گُر جانتے ہیں۔

ایک دن سکول سے واپسی پر اس نے اور فرخندہ نے اکٹھے رکشہ لیا۔ اس نے کہا پہلے مجھے اتار دو۔ راستے میں اس نے ایک میرج بیورو کا بورڈ دیکھا۔ رکشہ رکوا کر وہ سیڑھیوں سے اوپر چلی گئی۔ ایک بہت طرح دار خاتون بیٹھی تھی۔ اس نے شمائلہ اور لیلیٰ کے رشتے کی بات کی۔ اس نے بتایا رجسٹریشن کے 5 ہزار جب رشتہ دکھائیں گے دس ہزار اور شادی کے بعد 25 ہزار۔

''مگر آپ نے باہر لکھا ہے کہ یہ کام فی سبیل اللہ کرتی ہیں۔''

''ہاں وہ تو ہے مگر ہمارے بھی خرچے ہیں۔ دفتر کا کرایہ، فون اور بجلی کا بل اور پیٹ...... بچے بھی تو پالنے ہیں۔''

''اچھا آپ نام تو لکھ لیں۔ میں پیسوں کا انتظام کر کے پھر آؤں گی۔''

وہ پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔ اسے دیر ہوگئی تھی۔ گھر جا کر پتہ چلا لیلیٰ ابھی تک نہیں آئی۔ چار بج رہے تھے۔ یونیورسٹی سے وہ تین بجے آجایا کرتی تھی۔

''میں جاتی ہوں اسے تلاش کرنے۔''

شمائلہ بولی ''اتنی گرمی میں پیدل آئی ہو، پانی تو پی لو، کچھ کھا لو، ہوسکتا ہے تمہاری طرح وہ بھی پیدل آرہی ہو۔''

وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس نے کھانا کھایا اور نماز پڑھی۔ پانچ بجے لیلیٰ گھر آگئی۔

''گڑیا! اتنی دیر کیسے ہوگئی؟''

وہ نائلہ کے گلے لگ کر رونے لگ گئی۔

''کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟''

وہ کچھ نہ بولی بس روتے روتے نڈھال ہو کر گر پڑی۔

''آپی کی جان کچھ بولو نا کیا بات ہے۔''

''نعیم دس دن کی چھٹی لے کر گاؤں گیا تھا۔ اس نے شادی کر لی ہے۔ اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے۔ مجھے کہتا ہے چلو ہم کورٹ میرج کر لیں۔ میں تمہیں

شہر میں رکھوں گا۔ میں مجبور ہو گیا تھا۔ آپی اس نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ وہ جھوٹا ہے۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔''

''نہ میری پیاری گڑیا، دنیا نعیم پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس میں بہتری ہو گی۔ کیا پتہ اس کا خاندان تجھے قبول ہی نہ کرتا۔ تمہیں میرے لیے اپنی آپی کے لئے زندہ رہنا ہے۔ میری جان نہ رو۔ دنیا میں شادی سب کچھ نہیں ہوتی۔ ہم تینوں بہنیں مل کر سکول کھولیں گی اور بچوں کی تربیت کریں گی تاکہ پھر کوئی کسی لیلیٰ سے جھوٹا وعدہ کر کے اس کا دل نہ توڑے۔'' اس نے روتی ہوئی لیلیٰ کو گلے لگا لیا۔

☆☆☆

اولڈ ایج ہوم

آخری سیڑھی اور اس کے کمرے کے درمیان کم وبیش دس گز کا فاصلہ تھا۔ اور یہ فاصلہ اس کے لیے بڑی آزمائش کا مرحلہ بن جاتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتا تھا تو اسے کسی قدر اطمینان ہو جاتا تھا کہ اس کے پوتے اور پوتیوں کے حملے سے اس کا کمرہ محفوظ ہے مگر جب اس کے دونوں پٹ کھلے ہوتے تھے اور دروازے کے باہر کمرے کی کوئی نہ کوئی چیز پڑی ہوتی تھی تو اس کی پیشانی شکن آلودہ ہو جاتی تھی، اور چہرے کی بوڑھی رگیں زیادہ نمایاں ہو کر اس کی کرب انگیز دلی کیفیت کا اظہار کرنے لگتی تھیں۔

اس وقت کمرے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔

''اوہ میرے خدایا!'' اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا، اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ جس غارت گری کا اس نے اندازہ لگایا تھا وہ صورتحال سے کچھ کمتر ہی تھی۔ اس روز محمود اور اس کی دونوں بہنوں نے معمول سے زیادہ تباہی مچا دی تھی۔

پلنگ کی چادر جو اس کی بہو نے صرف ایک روز پہلے بدلی تھی اس پر جا بجا مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ انہوں نے پلنگ پر بیٹھ کر کوئی میٹھی چیز کھائی کم اور گرائی زیادہ تھی اور ہر طرف بکھرے ہوئے ریزوں نے مکھیوں کو دعوت عام دے دی تھی۔

میز پر کتابیں وہ بڑی ترتیب کے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ اسے اپنی کتابوں سے بڑی محبت تھی اور انہی کا مطالعہ کر کے اپنا وقت بتاتا تھا۔ یہ ساری کتابیں منتشر حالت میں پڑی تھیں۔

قالین پر اگالدان الٹا پڑا تھا۔ حقہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھا ہوتا تھا وہ کمرے کے عین وسط میں عالم بیچارگی میں پڑا تھا کہ اس کی چلم غائب تھی اور چلم کے کوئلے ادھر ادھر دکھائی دے رہے تھے۔

پنشن کے لئے گھر سے جانے سے پہلے وہ دھوبی سے دھلے ہوئے کپڑے لا کر کرسی کے اوپر رکھ گیا تھا کہ واپس آ کر انہیں الماری کے خانے میں رکھ دے گا۔ ان میں سے کوٹ نکل کر پلنگ پر پڑا تھا محمود نے ضرور اسے پہن کر دادا جان بننے کی کوشش کی ہو گی۔

ایسے میں اس کا صبر وقرار جواب دے جاتا تھا وہ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر اپنی بہو کو بڑے غصے سے مخاطب کرتا تھا اور اس روز بھی اس نے یہی کیا تھا۔

''زینب! تم اپنے بچوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتیں۔ اوپر آ کر دیکھو تو۔ کیا حالت کر دی ہے میرے کمرے کی۔''

بچے اپنے دادا جان کو گھر کے اندر آتے دیکھ کر چپکے سے کھسک جاتے تھے، اس لیے زینب انہیں بے تحاشا بددعائیں دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

''میں کیا کروں باباجی! آپ انہیں کیوں نہیں سمجھا سکتے۔''

اپنی بہو کا یہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ وہ تو سسر کی غصیلی آواز سنتے ہی دروازے کی طرف بھاگتی تھی اور محمود یا اس کی کوئی بہن ہاتھ آ جاتی تو مار مار کر ان کا کچومر نکال دیتی تھی۔ مگر اس روز اس نے ایک فقرہ کہہ کر اپنی طرف سے معاملہ ختم کر دیا تھا۔

ماں بچوں کو بددعائیں دیتی تھی تو اس کا غصہ بھی ذرا دب جاتا تھا لیکن اس روز اس نے جس ردعمل کا اظہار کیا تھا، وہ اسے بڑا غیر مناسب لگا۔ وہ کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔ اس کی پیشانی زیادہ شکن آلود ہو گئی تھی اور سانس شدید غصے کی حالت میں تیزی سے آنے جانے لگا تھا۔

''کیا اس نے بچوں کو شہ دی ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور نیچے آ گیا۔

زینب نلکے کے نیچے کپڑے دھو رہی تھی۔

''زینب! تم نے ان بدتمیزوں کو اتنی کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے، انہیں کمرے میں جانے کیوں دیتی ہو، تمہیں خبر نہیں کہ میرے کمرے کے اندر جا کر وہ کیا کرتے ہیں؟''

زینب نے ہاتھ میں ڈنڈا اٹھا رکھا تھا، جسے وہ کپڑوں پر مار رہی تھی۔ اپنے سسر کے الفاظ سن کر اس نے بے دھیانی میں ڈنڈا نلکے پر زور سے مار دیا اور چمک کر بولی: ''یہ میری کم بخت اولاد ہے تو آپ کی کچھ نہیں لگتی؟''

زینب اس کے سوال کا کیا جواب دے رہی تھی۔ اس کے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

''میری کچھ لگتی ہے یا نہیں لگتی؟''

زینب تڑپ اٹھی۔ فوراً بولی: ''کچھ نہیں لگتی ناں۔''

''زینب! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری چیزوں کو اس طرح تباہ کیا جائے۔''

''تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ پکڑ کے گلے گھونٹ دیں ان کے۔''

اس کی بہو کو کیا ہو گیا ہے، ترکی بہ ترکی جواب دے رہی ہے۔ بیٹا بھی اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اسے ضرور صورت حال کا علم ہو چکا ہے، مگر نہ باہر آیا ہے نہ بچوں کو معمول کے مطابق سرزنش کی ہے۔

''اچھا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔''

اور وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر آ گیا۔

مرزا عبدالقوم نے ساری زندگی صوبائی حکومت کے ایک دفتر میں ملازمت کی تھی۔ وہ معمولی کلرک سے اعلیٰ افسر کے عہدے تک پہنچا تھا اور اس کی ترقی کا حقیقی سبب اس کی ایمان داری، دیانت داری اور منصبی فرائض سے گہری دلچسپی تھی۔

ملازمت کے اختتام پر دفتر کے سربراہ نے بڑی کوشش کی تھی کہ اس کے دفتر سے وابستگی میں توسیع کر دی جائے مگر وہ خود اس پر راضی نہ ہوا۔ اپنے دوستوں سے تو اس نے یہی کہا کہ میں نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے اب یہ دوسروں کا حق ہے کہ وہ آگے بڑھ کر میری ذمہ داریاں نبھائیں میں کسی کا حق مارنا نہیں چاہتا۔اس کے دوستوں نے قطع ملازمت کا یہ جواز تسلیم کر لیا تھا لیکن دل کی بات اس نے کسی سے بھی نہیں کہی تھی۔اور دل کی بات یہ تھی کہ وہ دفتری ہنگاموں سے دور ہو کر بڑے پر سکون ماحول میں بقیہ زندگی بسر کرنے کا آرزومند تھا۔

خاموشی، سکون اور اپنا دن اور اپنی رات۔ یہ تھی اس کی آرزو، جو چھٹی کے وقت اپنے کاموں سے فراغت پانے کے بعد یا گھر میں اپنے مخصوص کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی اور وہ ان لمحوں کی گود میں چلا جاتا تھا۔ جب دفتر سے رشتہ منقطع کرنے کے بعد خاموشی، سکون اور اپنے سارے معمولات میں مکمل آزادی حاصل کرے گا۔اس ماحول کا تصور کرتے وقت اسے ایک عجیب سی خوشی مل جاتی تھی، اور وہ دیر تک اس تصور میں ڈوبا رہتا تھا۔

پہلے دن جب صبح اٹھ کر اس نے یہ خیال کیا کہ اب سارا دن اس کا اپنا ہے اور اسے کہیں بھی آنا جانا نہیں ہے کوئی بھی فریضہ ادا نہیں کرنا ہے تو اس کا دل سرخوشی کی ایک ایسی کیفیت محسوس کرنے لگا جسے وہ اپنی تمام تگ و دو کا حاصل سمجھتا تھا۔

وہ خوش تھا۔ مطمئن تھا۔

اس نے کمرے کو ٹھیک کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی بہو سے جو بچوں کے ساتھ ناشتہ لے کر آ گئی تھی ،کہا: ''زینب! اب تو یہی میری دنیا ہے۔ یہ میرا کمرا ہے۔اسے ٹھیک ٹھاک کرنا ہوگا۔تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ضرور باباجان! جو کچھ آپ چاہتے ہیں ہوجائے گا۔ حکم کیجیے۔'' اس کی بہو نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ صوفہ سیٹ پرانا ہوگیا ہے۔''

''نیا خرید لیں گے۔''

''میز بھی۔''

''یہ بھی نئی۔''

''بس ٹھیک ہے۔''

''باباجان! میں آج ہی پرانی چیزیں نکلوالوں گی۔ صوفہ سیٹ خرید لائیں گے اور محمود کے ابو بھی کہہ رہے تھے کہ اباجان اب گھر پر ہی رہا کریں گے۔ انہیں ہر طرح آرام پہنچائیں گے۔''

چند روز میں کمرہ ٹھیک ہوگیا اسے ٹھیک کرنے میں اس نے خود کم اور گھر والوں نے زیادہ حصہ لیا۔

ایک ہفتہ اس انداز میں گزرا جس انداز میں وہ گزارنا چاہتا تھا۔ دفتر کے پرانے ساتھی اس سے ملاقات کرنے آتے تھے۔اس کا پوتا اور دونوں پوتیاں چائے اور کھانا اس کے کمرے ہی میں پہنچاتے رہے۔ اس قسم کا ہنگامہ ضرور رہا لیکن اسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔احباب آتے ہیں تو آئندہ آنے سے رک جائیں گے۔اس کی بہو بچوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے میں جو شور کرتی ہے یہ بھی وقت ختم ہوجائے یا بہت حد تک تھم جائے گا جب وہ ان کی ماں کو سمجھا دے گا کہ بچوں کے ساتھ مادرانہ شفقت کا رویہ اختیار کرے۔ بچے اوپر آتے ہیں، اپنے جوتوں کے ساتھ اندر آکر قالین خراب کردیتے ہیں تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔وہ بھی بتا دے گا کہ اوپر میرے کمرے میں آؤ تو جوتے اتار کر آؤ۔

تین ہفتے بیت گئے اور پھر اس کے ذہن میں اندیشہ ہائے دور ودراز اپنا سایہ ڈالنے لگے۔اس نے سوچا تھا کہ دفتر کے کچھ لوگ آتے ہیں تو اظہار محبت کے لئے آتے ہیں۔

آخر کب تک یہ اظہار ہوتا رہے گا۔مگر اتنی مدت صبر سے کام لینے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

پہلے اس کے پرانے اور نئے ساتھی محض اسے اس کے شاندار کیریر پر مبارکباد دینے کے لئے آتے تھے۔ اب وہ اس سے ہدایات لینے کے لئے آنے لگے تھے۔

''سر! ایسے کاغذات کن فائلوں میں رکھے جاتے ہیں۔ بڑے افسر کے ہاں جا کر سوال کس طرح کرنا چاہیے؟''

یہ لوگ عام طور پر یہی سوال کرتے تھے، اور وہ جواب دے دے کر بور ہو جاتا تھا۔

اس سے بڑی کوفت اسے اپنے پوتے اور پوتیوں سے ہونے لگی تھی۔ وہ سیر و تفریح کی خاطر کسی سے ملاقات کے لئے کوئی چیز خریدنے کے لئے گھر سے باہر نکلتا تھا تو بچے سکول سے واپس آ کر گھر میں ہوتے تھے، تو بے تکلف اس کے کمرے میں آ جاتے تھے اور طوفان بدتمیزی مچا دیتے تھے چیزوں کی بے ترتیبی دیکھ کر اسے دکھ ہونے لگا تھا۔ اپنے کمرے کی تباہی پر اسے ہر بار ذہنی کوفت ہوتی تھی، مگر جب اس کی بہو بچوں کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ دیتی تھی بلکہ کسی نہ کسی کی پٹائی بھی کر دیتی تھی اور اس کا بیٹا بھی اگر گھر میں ہوتا تھا تو اس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لینے سے باز نہیں رہتا تھا تو اس کا غصہ کسی قدر ہلکا ہو جاتا تھا اور وہ آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آ جاتا تھا۔ مگر اس روز تو ان دونوں نے ایک ایسا رویہ اختیار کر لیا تھا جو اس کے لیے نا قابل برداشت تھا۔

بہو کا فقرہ ''تو میں کیا کر سکتی ہوں، پکڑ کر گلے گھونٹ دیں ان کے۔'' اس کے ذہن میں مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ بغیر کسی مقصد کے گلیوں اور بازاروں کے چکر لگا تا رہا۔ باغوں میں گھوما، کتابوں کی دکان سے کچھ کتابیں خریدیں اور ایک اخبار بھی۔

گھر پہنچ کر وہ کسی سے کچھ کہے بغیر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر گر کر ایک نئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ کتاب پڑھنا ممکن نہیں تھا اور اس کے اعصاب پر کچھ ایسا بوجھ پڑ چکا تھا کہ بستر سے اٹھ کر بجلی کے سوئچ بورڈ تک جانا دوبھر لگ رہا تھا۔

وہ کتاب بند کر کے لیٹ گیا۔

بہو اور بیٹے کی بے نیازی اسے یاد آ گئی اور اپنے وہ الفاظ بھی جو اس نے گھر سے نکلتے وقت اپنی بہو سے کہے تھے۔ ''اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تم لوگ چاہتے ہو

کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔''

''مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ کہاں سر چھپاؤں جا کر۔ کدھر جا سکتا ہوں۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اچانک اس کی بند آنکھوں پر کسی نرم سی شے نے مس کیا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی بڑی پوتی کلثوم پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''دادا ابو! سو گئے تھے آپ۔''

''کیوں آئی ہو یہاں؟'' وہ گرجا۔

بچی آنکھوں میں جو میٹھی سی معصومانہ مسکراہٹ جھلک رہی تھی فی الفور غائب ہو گئی۔

''دادا ابو!......'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

''وہ دادا ابو کھانا۔''

''نہیں، بھوک نہیں ہے مجھے۔ بھاگ جاؤ فوراً۔''

کلثوم باہر جانے لگی جب وہ کمرے میں آیا تھا تو اس نے ادھر ادھر نظر نہیں ڈالی تھی۔ آتے ہی بستر پر گر پڑا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ کمرے کی صفائی ہو گئی ہے مگر کتابیں بدستور منتشر ہیں۔

''جاہل عورت!''

وہ اپنی ان پڑھ بہو کو جاہل سمجھتا تھا۔ اس کے بیٹے نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ شروع ہی سے بہو کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ چند منٹ بعد بہو اور بیٹا آ گئے۔

''بابا جان! کھانا کھا لیجیے ناں۔'' یہ اس کی بہو کے الفاظ تھے۔

''نہیں۔ کہہ جو دیا بھوک نہیں ہے۔ کیوں پریشان کرتے ہو مجھے۔''

''مگر ابو آپ نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔'' اس کا بیٹا بولا۔

باپ نے خشمگیں نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور بیٹے نے نظریں جھکا لیں۔

کچھ اور اصرار کرنے کے بعد دونوں مایوس چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد اس نے پھر کتاب اٹھائی۔ لیکن آدھ صفحہ پڑھ کر ہی اسے چھوڑ دیا۔ سرہانے کے اوپر اخبار بھی پلٹا پڑا تھا۔ کتاب ایک طرف رکھ کر اس نے اخبار اٹھا لی......وہی دہشت ناک خبریں تھیں جو اخباروں میں نمایاں طور پر چھپتی ہیں۔ یکایک اس کی نگاہ ایک اشتہار پر پہنچ کر رک گئی۔

اس اشتہار میں امریکی طرز پر ایک اولڈ ہوم (Old age home) کے قیام کی خوشخبری سنائی گئی تھی اور ان بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں کو اس ہوم کے مالک احمد جاوید سے ملنے کو کہا گیا تھا۔ جو بڑھاپے میں پرسکون زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں نیچے احمد جاوید کا پتہ درج تھا۔

اس نے سانس روک کر یہ خبر پڑھی۔

''یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔''

اس نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔ اور اخبار لپیٹ کر تپائی کے اوپر رکھنے سے پیشتر وہ تین بار اس اشتہار کو پڑھ چکا تھا۔ صبح اس کی بہو ناشتا لے کر آ گئی۔

''بابا جی! خدا کے لئے انکار نہ کریں۔''

بہو نے یہ الفاظ بڑی لجاجت سے کہے تھے۔ اس نے بہو کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور وہ اپنے سسر کو بڑی ممنونیت سے دیکھنے لگی۔

جلدی جلدی ناشتا کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور احمد جاوید سے ملاقات کے لئے روانہ ہو گیا۔

احمد جاوید کی عمر پچاس پچپن سے کم نہیں تھی مگر بڑا چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ لباس فیشن کے مطابق، چوڑی پیشانی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ بڑی خوشی سے اس نے خیر مقدم کرتے ہوئے اسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ نام وغیرہ پوچھا، حالات دریافت کیے اور جب اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جس شخص سے وہ ملاقات کر رہا ہے وہ ہوم میں داخل ہونے کے لئے بے قرار ہے۔ تو بولا:

''مجھے آپ کی تشریف آوری پر بڑی مسرت ہوئی ہے۔ آپ کی خواہش کی تکمیل کر کے مجھے اور خوشی ہو گی۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ امریکہ میں گزارا ہے اس کی کچھ چیزیں مجھے پسند نہیں آئیں...... کچھ آئی ہیں اور ایک چیز جو بہت زیادہ پسند آئی ہے وہ ''اولڈ ایج ہوم'' کا سسٹم ہے، میں کئی بار اس قسم کے ایک ہوم میں گیا تھا اور وہاں رہنے والوں کو بہت مسرور اور مطمئن پایا تھا۔ سچ کہتا ہوں ان کے چہروں پر مجھے جو سکون نظر آیا تھا وہ قابل رشک تھا۔''

احمد جاوید نے ذرا رک کر اپنے ملاقاتی کا غور سے چہرہ دیکھ کر اس کے ردعمل کو بھانپنے کی کوشش کی۔ یہ ردعمل اس کی منشا کے عین مطابق تھا۔

''میں نے قیام امریکہ کے دوران میں اپنے ہاں اولڈ ایج ہوم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے محترم!

آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سن رسیدہ افراد کو بڑے سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ان بچاروں کو نہیں ملتا۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر میں نے زر کثیر صرف کر کے ایک بہت آرام دہ اور ہر لحاظ سے مکمل ہوم بنالیا ہے۔ اخراجات کے لیے بڑی معمولی رقم مقرر کی ہے۔''

''صرف ایک ہزار ماہانہ...... جو ہوم کی سہولتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔''

''ٹھیک......اور کچھ۔''

''اور کچھ؟ بس آپ چلئے میرے ساتھ میں آپ کو ہوم دکھادوں۔''

چائے پینے کے دس منٹ بعد وہ احمد جاوید کے ساتھ ایک خوبصورت سجے سجائے کمرے میں کھڑا تھا اس کمرے میں سب کچھ موجود تھا۔ صوفہ سیٹ، کرسیاں، میز، تپائیاں، بک شیلف، الماریاں، فرش یا قالین، دیواروں پر رنگا رنگ تصویریں۔ ایک طرف وال کلاک۔

احمد جاوید نے مزید سہولتوں کی تشریح کی۔

''ایک ملازم اور ایک ملازمہ خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ گھنٹی بجایئے ایک منٹ میں موجود۔ ناشتا، کھانا وقت پر۔ اور کیا چاہیے پرسکون زندگی کے لئے۔''

اسے کمرہ بہت پسند آیا۔

''اور کمرے بھی ہوں گے ان میں۔''

احمد جاوید بات سمجھ گیا۔

''اور کمرے ضرور ہیں مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، ابھی اس سسٹم کی ابتدا ہوئی ہے لوگ آتے جائیں گے اور ایک دن یہ ہوم واقعی اولڈ ایج ہوم بن جائے گا۔''

''تو ابھی صرف میں......''

احمد جاوید نے جواب دیا:

''آپ کی طرح ایک صاحب آئے تھے۔ بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ افسوس انہیں ایک پرانی بیماری نے کچھ زیادہ مدت خوشی سے زندگی بسر کرنے نہ دی۔ فوت ہوگئے۔''

اسی دن دوسرے پہر وہ اپنی کتابیں اور کپڑے لے کر گھر والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر احمد جاوید کے اولڈ ایج ہوم میں آ گیا۔

شام تک سار اوقت بک شیلف میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھنے، کمرے کے فرنیچر کا اچھی طرح جائزہ لینے نوکر اور نوکرانی سے متعارف ہونے میں

گزر گیا۔ نوکر کا نام بخشو تھا اور نوکرانی رشتے میں اس کی خالہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

ہاجرہ نے بڑے سلیقے سے چائے کی ٹرے اس کے آگے تپائی پر رکھی تھی اور خود مودب ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

''بس جاؤ۔''

''جی کوئی حکم۔''

''نہیں کوئی نہیں۔''

کتنی تربیت یافتہ نوکرانی ہے۔ اسے اپنی بہو یاد آ گئی۔ جو اس کے ایک مرتبے کہنے پر اول تو چائے بھیجتی ہی نہیں تھی۔ دو تین بار کہتا تھا تو کوئی بچہ چائے لے کر آ جاتا تھا جو کافی ٹھنڈی ہوتی تھی۔ دو تین گھونٹ بھر کر وہ پیالی ہاتھ سے رکھ دیتا تھا۔ اور جب سیر کے لئے باہر جاتا تھا تو کسی ریستوران میں بیٹھ کر خوشگوار ماحول میں چائے پی لیتا تھا۔

چائے پینے کے بعد اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر فضا میں دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس روز فضا کچھ بدلی بدلی لگتی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں نے اس کے ماتھے کو چھوا تو اسے ایک نئی لذت کا احساس ہوا۔

''خواہ مخواہ اتنا وقت اس منحوس گھر میں بتایا۔ کاش! اس ہوم کا علم ریٹائرمنٹ کے وقت ہی ہو جاتا۔''

اس نے سرد ہوا میں لمبا سانس لے کر سوچا۔

شام کو کمرے سے باہر نکلا اور سیرے کے لئے روانہ ہو گیا۔

گھنٹہ بھر ادھر ادھر گھومنے کے بعد کمرے میں آ گیا۔ احمد جاوید کرسی پر بیٹھا اس کا منتظر تھا۔

''ویلکم سر!'' تعظیماً اس نے اٹھ کر کہا۔

''شکریہ۔''

''میں صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا ہوں کہ کسی قسم کی دقت، کوئی تکلیف۔'' احمد جاوید نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل نہیں۔ بہت خوش ہوں۔''

''آپ یہاں ہمیشہ خوش رہیں گے۔ جلد ہی ایک اور صاحب آ جائیں گے۔ تنہائی نہیں رہے گی۔''

''کوئی صاحب آنے والے ہیں۔'' اس کا سوال تھا۔

''جی ہاں! انہیں بھی بڑھاپے میں سکون کی تلاش ہے۔ جلد جلد اپنے معاملات نپٹا رہے ہیں۔ بڑے خوش مزاج آدمی ہیں۔ امریکہ میں بھی کئی سال گزار

چکے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھی بنیں گے۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘

اور احمد جاوید شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔

رات کا کھانا آ گیا۔ سادہ کھانا تھا مگر مزے دار۔ کھانا کھا کر اس نے چائے منگوائی اور اس سے فارغ ہو کر کچھ دیر ایک کتاب کا مطالعہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

’’یہی سکون ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ خوش قسمت ہوں کہ میرا خواب پورا ہو گیا ہے۔‘‘

وہ جب تک جاگتا رہا۔ ایسے ہی خوش آئند تصورات اس کے ذہن پر چھائے رہے اور پھر سو گیا۔

صبح اٹھا تو اس کا جی بے اختیار چاہا کہ گنگنائے۔

؎ خدا جانے یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے
دنیا کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں
معلوم ہوتی ہے

ملحقہ غسل خانے میں وہ نہایا دھویا۔ نکلا تو چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔ چائے پی کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

فضا میں روشنیاں اترتی چلی جا رہی تھیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر زندگی جاگ اٹھی تھی بچے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں مدرسوں کو جا رہے تھے۔ اسے اپنے پوتے اور پوتیوں کا خیال آیا۔ ’’بدتمیز کہیں کے۔‘‘ اور وہ کھڑکی سے الگ ہو گیا۔

سکون کے دن تھے۔ سکون کی راتیں تھیں اور وہ خود کو ایک ایسا پنچھی محسوس کرتا تھا، جو پنجرے کی قید سے رہائی پا کر فضا کی وسعتوں میں پوری آزادی کے ساتھ اڑ رہا ہو۔

ایک ہفتہ بیت گیا ایک اور ہفتہ بیتا اور وہ شام کی چائے پی کر سیر کے لئے جانے والا تھا کہ اماں ہاجرہ نے اوپر آ کر اسے اطلاع دی کہ آپ کے گھر والے آئے ہیں۔

’’کیا ہے۔ آ گئے ہیں تو ہوا کیا ہے۔ مجھے واپس لے جانے سے تو رہے۔ چلے جائیں گے تھوڑی دیر بیٹھ کر بلا لو۔‘‘

اس کا بیٹا، بہو اور پوتا پوتیاں آ گئیں۔ بہو نے پھل کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔

’’السلام علیکم ابو! سلاماں لیکم بابا جی، دادا جان سلام علیکم۔‘‘

آوازیں بلند ہوئیں۔ اس نے سر کو جنبش سے جواب دیا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میاں بیوی صوفے پر اور بچے نیچے بیٹھ گئے۔

''ابو آپ یہاں خوش ہیں۔'' اس کے بیٹے نے سوال کیا۔

''بہت خوش ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔''

''اچھا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں دکھ ہے کہ آپ کو خوش اور مطمئن نہیں کر سکے تھے۔'' بیٹے کے لہجے میں دبا دبا دکھ تھا۔

''بابا جی! اسے کیا کہتے ہیں؟'' بہو نے پوچھا۔

''اولڈ ایج ہوم۔''

''اول......'' بہو کی زبان پر پہلا لفظ ہی نہ آ سکا۔

''یہ ہوتا کیا ہے بابا جی؟''

اس نے گلوخلاصی کے لئے دونوں ہاتھ لہرائے ''تم نہیں سمجھ سکتیں۔''

بیٹے نے باپ کو پھل کی ٹوکری دی۔

''مجھے یہاں کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ لے جاؤ بچوں کے لیے۔''

''نہیں ابو! یہ آپ کے لئے لائے ہیں۔''

باپ نے بیٹے کی طرف ٹوکری بڑھا دی تھی۔

اس دوران میں بچوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ دادا محمود کی طرف دیکھتا تھا تو وہ فوراً سر جھکا لیتا تھا۔ یہی حال ان کی بہنوں کا بھی تھا۔

''کتنی چالاکی سے تمیز داری کا ڈراما کر رہے ہیں۔'' یہ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا پڑا۔

گھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کون کون ملنے کے لئے گھر آیا اور اسے کیا بتایا گیا۔ ہمسائیوں کے سامنے اس کے بارے میں کیسی کیسی غلط بیانی کی گئی۔ یہ سب کچھ اسے بتایا گیا۔

''خبردار! کسی کو بھی یہاں کا علم نہ ہو۔'' اس نے تاکیداً کہا۔

''جی ابو! ہم نے کسی کو نہیں بتایا۔ آپ نے جو کہہ دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔''

وہ جانے لگے ایک بڑا سا لفافہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ خط تھے جو اس کے نام دس کی عدم موجودگی میں آئے تھے۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے لفافے سے خط نکالے اور ایک ایک کو پڑھنے لگا۔

ایک خط کتابوں کی ایک دکان سے آیا تھا، جس میں اسے New Arrivals کے بارے میں اطلاع دی گئی۔ دوسرا خط اس کے پرانے دفتر کی یونین کی سیکرٹری

کی طرف سے تھا جس میں اس سے درخواست کی گئی تھی کہ اپنے پرانے ساتھی فیروز دین کی الوداعی پارٹی میں شامل ہو کر ممنون فرمایئے۔ دو خطوں میں اس کے دوستوں نے اپنے بیٹوں کی شادی پر اسے مدعو کیا تھا۔

کتابوں کی دکان والا خط اس نے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور باقی پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔

''اب میرا ان لوگوں سے کیا تعلق واسطہ؟''

ایک مہینہ گزر گیا۔ نوکر اور نوکرانی نے اپنی ذمے داریوں میں کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں کی تھی، مگر اس روز صبح کی چائے چھ بجے کی بجائے ساڑھے سات بجے ملی۔

''معاف کرو باباجی!'' ہاجرہ نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ ''چائے دیر سے ملی۔ دیر سے جو آئی ہوں۔''

''اچھا۔'' اس نے ہاجرہ کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

''وہ جی...... بیمار ہو گیا تھا۔''

''کون بیمار ہو گیا تھا۔'' اس نے یونہی سوال کر دیا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''جی! وہ میرا پوتا جی۔ بڑا فکر ہے جی۔ بیمار ہی چھوڑ کر آئی ہوں۔ میرا دھیان اسی میں لگا ہوا ہے۔ دعا کریں بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا اور وہ ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''دعا کریں گے نا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ناشتہ تھوڑی دیر بعد یا ابھی۔'' ہاجرہ نے ٹرے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''تھوڑی دیر بعد۔''

اور یہ الفاظ سن کر وہ چلی گئی۔

وہ جب کھڑکی کی طرف جا رہا تھا تو اسے اپنے پوتے کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ ہی پوتے اور پوتیوں کے چہرے اس کے سامنے آ گئے۔ ''اس روز کتنے مودب ہو کر یہاں بیٹھے تھے۔''

وہ مسکرانے لگا۔

دھوپ پھیل چکی تھی۔ بازاروں میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ اس کی نگاہیں دور سکول کی عمارت پر پڑیں۔ بچے قطاروں میں کھڑے تھے۔ دعا کر رہے ہوں گے۔ وہی دعا جو اس کا پوتا اور پوتیاں گھر آ کر کبھی اسے سنایا کرتی تھیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

وہ کھڑکی میں کھڑا رہا۔قریب کمرے کے اندر شور ہوا۔اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ بخشو تھا جو ناشتہ لے کر آیا تھا۔ بیڈ ٹی اور ناشتہ ہاجرہ ہی لایا کرتی تھی۔ ناشتے کے بعد بخشو حقہ تازہ کر کے لاتا تھا۔ ناشتا لانا اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔

''ہاجرہ کہاں ہے؟'' اس نے کھڑکی سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اسے اپنے پوتے کا بڑا فکر ہے گھر چلی گئی ہے۔''

''زیادہ بیمار ہو گیا ہے۔''

''کہتی تھی بڑا کمزور ہو گیا ہے۔''

وہ کرسی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ چند منٹ گزرنے پر بخشو حقہ لے آیا۔

''تازہ اخبار لے آؤں بازار سے؟''

''نہیں میں خود لے آؤں گا۔''

ناشتہ کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان کے ساتھ حقے کے کش لگاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کش لگا رہا تھا اور جلد باہر نکلنا چاہتا تھا۔

اخبار خرید کر وہ اپنی منزل متعین کیے بغیر چلا گیا۔ اخبار کی بڑی خبریں وہ کسی باغ میں بیٹھ کر پڑھنا چاہتا تھا۔اس روز بھی ایک باغ کے اندر پہنچ کر بیٹھ گیا۔

ایک دم شور ہونے لگا۔ اس نے سامنے دیکھا۔لڑکے آدھی چھٹی کے وقت خوش خوش شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل رہے تھے۔اسے سکول کی عمارت شناسا محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس سکول کے پاس بیٹھا ہے جس میں اسکا پوتا اور پوتیاں پڑھتی ہیں۔

''پتا نہیں میں یہاں کیسے آ گیا۔''

وہ اخبار سرسری طور پر دیکھنے لگا۔ چند منٹ میں سارا اخبار دیکھ لیا۔اٹھا تو اس کے پاس وہ تینوں کھڑے تھے۔

''تم......؟''

تینوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیئے۔

''ٹھیک ہو؟''

پھر اسی طرح سر ہلنے لگے۔

''دادا ابو! ہم......''

کیا یہ وہی بچے ہیں جنہوں نے اسے اس قدر پریشان کر دیا تھا۔وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

آدھی چھٹی کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ سکول کی گھنٹی اس کا اعلان کررہی تھی۔

''جاؤ اپنی کلاسوں میں۔''

اور وہ باغ سے باہر نکلنے لگا۔ باہر نکل کر وہ بغیر ارادے کے رک گیا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ تینوں ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ واپس پہنچا۔ بخشو کمرے کی صفائی کر چکا تھا۔

''جناب! یہ آپ کا ہے۔'' بخشو کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ ''صفائی کرتے ہوئے وہاں سے ملا ہے۔'' بخشو نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں۔ میرا تو نہیں ہے۔ دکھاؤ۔''

اس نے لفافہ لے لیا۔

''شاید۔'' یہ ان صاحب کا ہے جو پہلے یہاں رہتے تھے۔''

''وہ بابا جی...... بے چارے یہیں مرگئے تھے۔'' بخشو نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''کھانا کتنے بجے جی۔ ہاجرہ نہیں ہے ناں۔ میں بھی پکا لیتا ہوں جی۔''

''جب پکا چکو تو لے آنا۔''

بخشو چلا گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ لفافے پر پتا درج تھا۔ برخوردار الطاف احمد، مکان نمبر 31 ڈی۔ محلّہ ست رنگاں، اندورن موچی گیٹ لاہور۔

''یہ الطاف احمد کون تھا۔ برخوردار کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھنے والے کا کوئی چھوٹا عزیز ہوگا۔ ممکن ہے بیٹا ہو۔ تو اس نے بیٹے کو کیا لکھا تھا اور یہ خط پوسٹ کیوں نہیں ہوا تھا۔ یہیں کیوں پڑا رہا؟''

ایسے سوالات نے اس کے ذہن کا احاطہ کرلیا تھا۔

''اب تو ہے نہیں جس نے خط لکھا تھا۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' اس نے لفافہ کھولنے کے لئے جواز تلاش کرلیا۔

ذرا سی ہچکچاہٹ...... اور پھر لفافہ چاک ہو چکا تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔ الفاظ ٹیڑھے میڑھے تھے۔ لگتا تھا لکھنے والے کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

میرے عزیز بیٹے!

تم پر اللہ کی سلامتی ہو

چار دن سے میری حالت کافی خراب ہوگئی ہے۔ ہارٹ بار بار سنک کرتا ہے۔ زندگی سے اب مایوسی ہی

مایوسی ہے۔

میرے عزیز اور پیارے بیٹے! تمہاری ماں کے انتقال کے بعد میں بری طرح یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ بالکل بے آسرا اور بے سہارا ہوگیا ہوں۔ مجھے تم سے، تمہاری آپا سے یہ شکایت ہوگئی تھی کہ تم لوگ میری پروا نہیں کرتے۔ تم لوگوں کا سارا وقت اپنے بچوں، دوستوں اور سہیلیوں کے لئے وقف ہوکر رہ گیا ہے، اس کا ردعمل یہ ہوا تھا کہ میں اپنے گھر سے بیزار ہوگیا تھا۔ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگوں۔ انہی دنوں احمد جاوید سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ امریکہ میں اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں اولڈ ایج ہوم، بوڑھوں کے لئے ایک جنت ہوتی ہے جس میں رہنے والے بڑی پرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے اسی طرز کا ہوم بنالیا تھا اور میں اس کی باتوں سے متاثر ہوکر اس کے ہوم میں آ گیا تھا۔

یہ چند ہفتے جو میں نے یہاں گزارے ہیں، میرے لیے عارضی سکون لے کر آئے تھے۔

بیٹا جب میں بیمار ہوا ہوں۔ تم سب لوگ مجھے بہت یاد آرہے ہو اپنے کنبے کی جدائی مجھ پر شاق گزرنے لگی ہے۔

الطاف بیٹے! اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یورپ میں گھر کا کیا تصور، میں نہیں جانتا مگر ہمارا گھر تو ہماری چھوٹی سی ایک دنیا ہوتی ہے اس میں رہنے والے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ انہیں الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ایک درخت کی طرح، جس کی شاخیں زمین کے اندر ایک دوسرے سے گتھی ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر بزرگوں کی شفقتوں، جوانوں کے قہقہوں اور بچوں کی معصوم مسکراہٹوں سے آباد ہوتے ہیں۔ یہی سب کچھ ہماری زندگی کی رونق ہے۔ ہماری زندگی کی بہار ہے۔ اس میں زندگی کا سارا حسن ہے۔

یہاں تنہائی مجھے اندر ہی اندر چاٹتی رہی ہے۔ مجھے اب اسکا علم ہوا ہے۔

مرے پیارے بیٹے! آؤ اپنے بیمار اور لاچار باپ کو اس گھر میں لے جاؤ جس میں حقیقی سکون ہے۔ آؤ الطاف! جلدی آؤ...... میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔''

یہ تحریر پڑھ کر اس کے اندر ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا اور ٹہلنے لگا۔

وہ کئی منٹ تک ٹہلتا رہا۔

بخشو آیا ''جناب کھانا لے آؤں۔''

’’مجھے یہ بتاؤ یہ خط یہیں کیوں پڑا رہا۔‘‘

بخشو سوچ کر بولا: ’’جناب! میں نہیں جانتا۔ اس نے ہاجرہ کو دیا ہوگا۔ وہ بھول گئی ہوگی۔‘‘

’’اس کے گھر سے کوئی آیا تھا؟‘‘

’’مرنے کے بعد اس کا بیٹا آیا تھا اور میت لے گیا تھا۔‘‘

وہ پھر کمرے میں پھرنے لگا۔

’’کھانا لے آؤں جناب!‘‘ بخشو نے پوچھا۔

اس نے ملازم کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کتابیں ایک طرف رکھنے لگا بخشو اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

نصرت یوسف

شکست کے رتھ پر سوار

حمنہ پہ اس واقعے کا گہرا اثر تھا، اس کا زیور خاصا زیادہ تھا۔ کرن کی شادی کے لئے صرف ایک دن پیشتر ہی وہ عرصہ بعد نکال کر لائی تھی۔ فیروزے کا وہ سیٹ اس کی نانی کے زمانے کا شاہکار نمونہ تھا جو اس نے فیرویزی سلک کی ساڑھی کے ساتھ پہنا تھا۔ روبی کا وہ اسٹائلش سا سیٹ جو امینہ نے بہت اچھے سنار سے گراں ترین قیمت پر پسند کے مول دے کر خریدا تھا۔ اور وہ بریسلٹ جو فوزان نے رونمائی کا تحفہ دیا تھا۔ کتنی ہی انگوٹھیاں اور کانوں کے آویزے جو وہ وقتاً فوقتاً خریدتی رہی تھی اور جن کی وجہ سے ہر سال زکوٰۃ کا حجم بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ سب ہی حمنہ کے پاس سے چلا گیا جو بچ گیا لاکر میں، اسے استعمال کرنے کی ہمت شاید وہ ایک مدت نہیں کر سکتی تھی۔

نقصان اتنے عنوانات کے ساتھ ہوا تھا کہ سطحی سکون سے گہرائی میں توڑ پھوڑ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ خوف مونس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔ نشوا کے گالوں کو چھوتے ہاتھ فوزان کے اندر چنگاریاں بھر گئے تھے۔ مگر بے بسی کے ساتھ قریب موجود حمنہ نے اس کو نگاہوں سے التجا کرتے ہوئے کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کرنے سے روک دیا۔ وہ بس ایک مرتبہ ہی چیخا تھا۔

''خبردار! جو میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا۔''

یہ جسارت کرنے والے نے اطمینان بھرا قہقہہ لگا کر مونس کا ہاتھ پکڑ لیا ''شہزادی نہ سہی شہزادہ ساتھ لے جاتے ہیں۔''

''بچوں کو چھوڑو تمہیں جو ساتھ لے جانا ہو لے جاؤ۔'' امینہ کی آواز میں نہ جانے کیسے تحکم آ گیا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر اس ادھیڑ عمر خاتون کو دیکھا جس کی نگاہوں میں بے خوفی تھی۔

''لے ماتا جی تیری بات مان لی۔'' اس نے بے فکری سے کہتے ہوئے ایک بار پھر نشوا کے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور ہنستے ہوئے ان سب کو بندھے ہاتھوں سمیت ایک کمرے میں دھکیلنے لگا۔ عجیب بات تھی کہ اس نے صرف حمنہ کے منہ پر ماسکنگ ٹیپ چپکایا تھا، اس

لیے وہ کچھ بھی نہ بول پا رہی تھی مگر یہ بات حمنہ جانتی تھی کہ بالکل ایسا ہی ڈاکے کا منظر کسی بھارتی فلم میں دکھایا گیا تھا۔ اس میں وہ میاں کی مزاحمت پر اسکو گولیاں مار کر بچے بھی لے جاتے ہیں اور پھر بچے کو کسی فارن ایجنسی کو فروخت کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں بطور تجربہ ریسرچ میں استعمال کریں۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھی۔ اس وقت تو اس کا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ یہ ظالم اس فلم کو مزید کاپی نہ کریں۔

اور پھر ڈھائی گھنٹہ کے اعصاب شکن لمحات کے بعد ''فاتح'' مال اور اعصاب لوٹ کر اس گھر سے نکلے تو اس گھر کے ہر مکین کی حالت خستہ ہو چکی تھی۔ وہ شدید درجہ پر دہشت زدہ تھے۔ ہاں اوپر سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ہی دنیا نمٹانی تھی۔ سو سب ہی بظاہر کچھ عرصہ میں سیٹ ہوئے نظر آتے تھے۔ مگر مونس راتوں کو سوتے ہوتے رونے لگتا۔ اس کی گھٹی گھٹی سی رونے کی آوازیں باوجود نفسیاتی علاج کے مکمل ختم نہ ہو رہی تھیں۔ حمنہ حد درجہ اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگی تھی۔

پھر کسی نے اسکو عمرہ پر جانے کا مشورہ دیا۔ نئے گھر، نئے بزنس کا شوق فی الحال کہیں گم ہو گیا تھا۔ فوزان نے بھی اس واقعے کے بعد یہ موضوع نہ چھیڑا۔ وہ ہر دوسرے دن تھانے کا چکر لگاتا، اس امید پر کہ شاید مجرم گرفت میں آجائیں، مگر ایسے نظام میں جہاں خود غرض اور بے انصافی عروج پر ہو، مجرم پکڑے نہیں جاتے، اور پھر تنگ آکر اس نے بھی اس لاحاصل جدوجہد کو ترک کر دیا۔ ماں، بیوی بچوں سمیت عمرے سے واپسی میں اس کی نظر ائیرپورٹ کے احاطے میں رکتی کسی گاڑی پر پڑی غالباً کوئی سرکاری افسر تھا، جس کے ساتھ اس کے گن بردار محافظوں میں ایک وہی تھا جو گھر میں واردات میں شریک تھا۔

شرارے سے اس کو اپنے جسم میں جلتے لگے، بے ساختہ اسکی نگاہ حمنہ اور نشوا کی طرف اٹھی، عمرے سے واپسی پر دونوں ہی باحجاب تھیں۔ وہ بھی شاید فوزان کو کچھ پہچان گیا تھا۔ دلیری سے آنکھ مارتا ہوا اپنے آقا کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

''یا اللہ! کب آئے گا صحیح نظام، اگر آج ہوتا تو میں اس کمینے کو مزہ چکھا دیتا...... شکر ہے سوائے میرے کسی کی نگاہ اس منحوس پر نہ پڑی۔''

فوزان نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ سب کچھ ایک بار پھر تازہ ہونے لگا۔ اتنی بے خوفی اتنی جرأت،

فوزان نے دانت پیسے مگر حقیقت پر کچھ اثر نہ پڑنا تھا۔ غنیمت تھا کہ مونس کی کیفیت خاصی حد تک بہتر ہوگئی تھی۔ اب تو سال ہونے کو تھا۔ عمرے کے بعد تبدیلی تو حمنہ میں بھی آ گئی تھی اور اب کے یہ تبدیلی پائیدار بھی لگتی تھی۔ ورنہ شادی کے چند سال بعد بھی اس نے حجاب اپنایا تھا، لیکن وہ نبھا نہ سکی، کتنے ہی لوگوں نے کتنے ہی ایسے تبصرے کیے جو وہ سہہ نہ پائی۔ فوزان کے دوست تیمور کی الہڑ شوخ سی بیوی نے اپنے تازہ ٹرپ کے فوٹو البم دکھاتے ہوئے ان میں سے اپنی ایک تصویر پر انگلی رکھ کر پوچھا تھا کہ ''کیا آپ نجا بن کر ایسے فوٹو کھنچوا سکتی ہیں؟'' وہ اس میں اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر بھاگ رہی تھی۔ پیچھے سمندر کی پرزور لہریں تھی اور ڈوبتا سورج اس کے ہوا سے اڑتے بالوں پر جیسے چمک بکھیر رہا تھا۔

''یار حمنہ بھابی! اصل پردہ آنکھ میں ہوتا ہے، لائف انجوائے کرنے کے دن ہیں، پھر بڑھاپے میں یہ شوخیاں کہاں، چھوڑیں یا ورمزے کریں۔''

چنچل سی نازش نے ہنستے ہوئے حمنہ کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ بھی ہنس پڑی۔ بے اختیار اس نے اپنے بادامی رنگ کے عبایہ پر نظر ڈالی جس کے سکارف پر اس نے خصوصی طور پر پینٹ سے تجریدی آرٹ کا ڈیزائن بنوایا تھا۔

''کتنی بے فکر ہوگئی ہیں آپ اپنے بالوں کی طرف سے، اتنے اچھے بال ہیں، اتنا ٹائم ڈھک کر رکھیں گی تو کیا سفید ہونے پر دکھائیں گی؟ آپ کو اتنی بزرگی میں دیکھ کر تو میں حمنہ بھی نہیں کہہ پا رہی۔''

اس نے حمنہ کی نظر کا ارتکاز ایک بار پھر جلترنگ سی ہنسی سے ختم کیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر نازش کے مختصر اور جدید کپڑوں کو دیکھنے لگی جس میں وہ کوئی کم سن سی لڑکی لگ رہی تھی۔

''واقعی میں اس کے آگے کتنی مختلف لگتی ہوں، مجھے اس کی بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہ ہی عمر تو ہے اسٹائل اور فیشن کی، یہ سب تو بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔'' حمنہ کی سوچیں تبدیل ہو رہی تھیں۔ فوزان کے اپنے خالہ، ماموں کے ہاں بھی سب نجا نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ مجھے ہی نیک پروین اپنے آپ کو دکھانے کا شوق چلا تھا۔ اب جو پردہ نہیں کرتا اس کا یہ مطلب تو نہیں وہ بے حیا ہے۔'' گھر آ کر اس نے عبایا کو مسترد کیے گئے کپڑوں میں رکھ دیا۔

امینہ نے بہت افسوس کے ساتھ یہ تبدیلی دیکھی، وہ خود کئی تبصرے سن چکی تھیں جو حمنہ کی حوصلہ شکنی کے

لئے کافی تھے، سرسری سے کہے ہلکے پھلکے جملے کیسے ہدف پورا کرتے ہیں، ان کونظر آ گیا تھا۔

ایک نے تاسف سے تبصرہ کیا تھا’’فائدہ تمہارے بالوں کے بلو ڈرائے کا، سکارف اوڑھوگی تو سب ہی ختم۔‘‘

’’حمنہ بھابھی! آپ تو اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی ہیں۔‘‘

’’ہاں تم کواب کپڑوں کی کیا فکر، کچھ بھی پہنا بس یہ کوٹ سکارف اوپر پہن کر گھر سے پیرنٹس ٹیچر میٹنگ میں چل پڑیں خاتون۔‘‘

ان کے بھانجے کی بیوی تقدیس حمنہ کی اچھی دوست تھی۔اس کے ساتھ شاپنگ پر جاتے ہوئے تنک کر بولی تو حمنہ ٹھٹک گئی۔

’’لیکن ہم کسی بھی پیرنٹس میٹنگ میں تونہیں جارہے۔‘‘

’’ہاں نہیں جارہیں تو کچھ عرصہ بعد جاؤ گی، تمہارے مستقبل کا نقشہ بھی یہ ہی ہوگا۔‘‘حمنہ نے اس وقت اس کی بات ہنسی میں اڑادی تھی مگر پھر پورے چار سال یہ برداشت کرنے کے بعدوہ حجاب پہ برقرار نہ رہ سکی تھی۔

اب یہ سب گزرے وقتوں کی سی بات لگنے لگی تھی۔گھر میں ہونے والے واقعے نے سب کوہی زندگی بے بندگی سے پھوٹنے والے فسادات کا واضح ادراک کرا دیا تھا۔ یہ سبق ان تمام نصیحتوں اورتقریروں سے بہت درجہ بہتر تھا جوانہیں اماں جان امینہ کی محدودسوچ لگتی۔

انسان اورتجربے کا رشتہ بڑا عجیب ہے! تجربہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ بہت کچھ کھو دیتا ہے۔ لیکن بہت کچھ بچانا بھی یہ تجربہ ہی ممکن بنا دیتا ہے۔فوزان اورحمنہ کی ذہنی اورقلبی کیفیت میں بہت کچھ مثبت تبدیلی کا پیش خیمہ بھی یہ ہی تجربہ بنا۔ نظام حیات اللہ کی بتائی حدود پر ہی ترتیب دینا چاہیے، وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے۔دنیا ظلم فساد سے بھر جاتی ہے اگررب کا طریقہ چھوڑ کر دوسرا حکم نافذ کیا جائے۔

’’کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگران سب چوروں کے ہاتھ کٹ جاتے جو میرے گھر میں لوٹ مار کرتے رہے۔ میری بیٹی کو اپنے پلید ہاتھوں سے چھوتے رہے۔میرا بیٹاان کے خوف سے بیمار پڑ گیا۔‘‘

حمنہ کے دماغ میں ابھرنے والی سوچیں اس کے

اپنے اعصاب میں بھی تناؤ پیدا کر دیتی تھیں......زندگی کے اس واقعے نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ امینہ دعا کرتی تھیں کہ ایک آزمائش مزید مثبت تبدیلیوں کو جنم دیتی ہے تو سودا برا نہیں۔ نشوا جو کبھی اسٹیج تک پہنچ کر رقص کی ضد کر رہی تھی اور اس کو سمجھانا ماں باپ کے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔ اس پروگرام سے بس ایک رات قبل تو یہ واقعہ ہوا تھا۔ اور کوئی نہ جانتا تھا کہ نشوا کے بدلے جس لڑکی کو اس کی اپنی خواہش پر اسٹیج تک بھیجا گیا، اس نے اپنا کردار اس طرح نبھایا کہ اس منٹوں کی پرفارمنس نے شوبز کے دروازے اس پر وا کر دیئے۔ بظاہر دنیا کی کامیابیاں اس کے گرد اس طرح منڈلانے لگی تھیں جیسے مقناطیس ذرات کو کھینچ رہا ہو۔ عالم کائنات کی تدبیر کرنے والے نے امینہ کے دعاؤں میں پھیلے ہاتھوں کی لاج رکھ لی تھی۔ بے شک مادی، جذباتی بہت نقصان ہوا کہ مداوا کرتے کرتے تھکان ہونے لگتی لیکن یہ اس نقصان سے کہیں درجہ بہتر تھا جو نشوا کے اسٹیج پر پہنچنے سے ہو جاتا۔

حمنہ نے جب اس خیال کا ذکر فوزان سے کیا تو وہ خاموش نگاہوں سے بیوی کو دیکھنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے ایک لفافہ حمنہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے کچھ الجھی نگاہوں سے میاں کو دیکھا اور لفافے میں رکھے پیپرز کھینچ کر نکال لیے۔

ایک لمبے چوڑے ای میل کا پرنٹ آؤٹ تھا جو فوزان کے والد ہارون ربانی کی جانب سے حمنہ فوزان کے لئے تھا۔ ابتدائی القاب اور رسمی کلمات کے بعد انہوں نے حمنہ سے بھرپور اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے عنقریب پیرس میں ہونے والے کسی فیشن شو میں شرکت کے لئے ابھارا تھا۔ سفر کے اخراجات سے لے کر تمام کاغذائی کارروائی تک انہوں نے تیزی سے مکمل کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا ''فیشن شو میں شرکت سے تمہارے اور فوزان کے کام میں نئی جہت پیدا ہوگی......تم دیکھو گی دنیا کے رجحانات کیا ہیں اور کیسے زمانے سے قدم ملا کر چلنا ہے۔'' اور ایسے کتنے ہی اسباق انہوں نے بڑی عمدگی سے بہو کو پڑھانے چاہے تھے۔

پوری ای میل پڑھنے کے بعد حمنہ نے نگاہ اٹھا کر فوزان کو دیکھا جو بے تاثر چہرے کے ساتھ سامنے دیوار کو تک رہا تھا۔

''فوزان!''

اس نے پکارا تو اس نے گردن موڑ کر بیوی کو

دیکھا، آنکھوں میں عجیب بیگانگی تھی جیسے اسے حمنہ نے نہیں بلکہ ہارون ربانی نے پکارا ہو۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ان صاحب سے واضح بات کر لینی چاہیے کہ وہ ہم سے رابطہ کرنے کی زحمت نہ کیا کریں۔''

فوزان نے اس کی اس بات پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ واضح طور پر منتشر سا لگ رہا تھا۔ زندگی میں طرح طرح کے حالات وواقعات سے نمٹنے کے باوجود آج بھی باپ کے حوالے سے کوئی بھی حوالہ یا معاملہ اس کو وہی چھوٹا فوزان بنادیا کرتا تھا جو اپنے لمبے چوڑے باپ کی آنکھوں میں اس کی ماں کے لئے لپکتے شعلے دیکھ کر سہم گیا تھا۔ وہ شخص اس کی ماں سے کیا کہتا تھا، وہ نہیں جانتا تھا، لیکن نظر نہ آنے والی لہریں اس شخص سے ایسی خارج ہوئیں کہ اسے لگتا جیسے اردگرد کی روشنی ان لہروں نے جذب کر لی ہو...... روشنی اور آکسیجن دونوں!

جب وہ باپ سے جدا ہوا تو اتنا چھوٹا تھا کہ یادداشت میں کوئی تاثر نہ تھا۔ یہ بھی قدرت کا احسان ہے کہ یادوں کا انبار جمع ہونے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے دماغ خالی، بےفکرا رکھا جاتا ہے تاکہ زندگی کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اس میں توانائی آسکے۔ ایسا نہ ہوتو بندہ کچھ بھی نہ سہہ سکے۔

ہارون ربانی کا یہ تاثر تو اس دن دماغ نے محفوظ کیا جب اس کا اسکول کا پہلا دن تھا۔ فوزیہ پچھلے سال اسی اسکول میں داخل ہوئی تھی۔ امی ہی اسکول چھوڑنے اور لینے آتی تھیں۔ وہ دونوں بچے ہی تو تھے، سہم گئے جب ایک شاندار سی گاڑی سے کسی انکل نے اتر کر ان سے ان کے نام پوچھے اور ساتھ چلتی امی بے تاثر چہرے کے ساتھ قدم بڑھاتی رہیں۔ یہ چھٹی کا وقت تھا۔ اردگرد خاصا رش تھا۔ بچے ماں سے چمٹ گئے تو اس شخص نے نہ جانے ان کے اسکول کے متعلق کیا کہا، وہ تو فوزان نہ سن سکا لیکن اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی کرختگی فوزان کے کچے دل ودماغ پر نقش ہوگئی۔

اور پھر یہ ہوتا رہا، یہ کرخت چہرہ کہیں نہ کہیں ابھرتا اور فوزان کو لگتا اردگرد کی فضا میں دھواں سا بھر گیا ہو جس سے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔ امینہ کے چہرے پر بھی ایسے ہی زردی سی چھا جاتی۔ وہ بچوں کو ایسے چمٹا لیتیں جیسے اپنا آپ اسی لمحہ ان پر قربان کر دینگی۔ وقت کے ساتھ آئے شعور نے یہ بتایا کہ یہ ہی چہرہ وہ ہے جسے دنیا ان کا باپ کہتی ہے۔

''امی! کیا سب کے ہی ڈیڈی ایسے ہوں گے؟''
ایک روز اس نے بڑی معصومیت سے یہ سوال اس وقت پوچھا جب لمحوں قبل ہارون ربانی کی گاڑی سامنے سے گزری اور انہوں نے فوزان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔
''جو منظر انسان دیکھنا نہیں چاہتا وہ اتنی کثرت سے سامنے کیوں آتا ہے؟''
امینہ نے فوزان کے مبہم سے سوال پر توجہ دیئے بغیر جوتوں کی دکان میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔ اردگرد لگے طویل شیشوں میں ابھرتے اس کے عکس میں تھرتھری سی ہوئی اور اگلے ہی لمحہ وہ الٹے قدموں دکان سے واپس باہر آ گئی۔ دکان کے دوسرے دروازے سے داخل ہونے والا شخص ان کے بچوں کا باپ بے شک تھا لیکن اس کا سامنا کرنا وہ اپنے اختیار سے باہر سمجھتی تھیں۔ ان کا دل سہم کر سکڑ جایا کرتا تھا کہ نہ جانے اب اس وجود سے مزید کیا شر ان تک آ سکتا ہے۔ اس کے اختیارات ان کے بچوں کو ان سے کسی بھی وقت جدا کر سکتے ہیں۔ وہ بہ خوبی یہ بات جانتی تھیں۔ اور جس زمین کے حصہ پر وہ تھیں وہاں طاقت اور شر کے بل پر کچھ بھی کسی بھی لمحے ممکن تھا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہراساں کرنے کے جرم میں میں بھی اس شخص کو سزا دلوا سکتی۔''
انہوں نے آہ بھر کر سوچا اور گزرتے رکشہ کو تیزی سے ہاتھ دے کر اس میں بیٹھ گئیں۔ پورا راستہ وہ مڑ مڑ کر دیکھتی رہیں۔ فوزان کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ گھر پہنچنے تک ماں کی پریشانی اسکے دل ودماغ میں پھیلی لاتعداد نسوں کے جال میں سفر کر گئی تھی۔ اور پھر ایسے اثرات کے ساتھ گزارا گیا بچپن دونوں بہن بھائیوں میں باپ کے لئے قطعاً گنجائش چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔
امینہ کے چہرے پر بھی سکون اس وقت اترا تھا جب علیحدگی کے چھ سال بعد خبر پتہ چلی کہ ہارون ربانی ملک سے باہر منتقل ہو گئے ہیں۔ بچوں نے بھی ماں کے انداز میں تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ گو انہوں نے کبھی امینہ سے ان کے باپ کے حوالے سے کوئی منفی بات نہ کی تھی لیکن بن کہے بن سنے فطرت کے ساتھ لگا ریڈار دل سے قریب رشتوں کی خوشی، غمی جان لیتا ہے۔ بچوں میں بھی شوخی اس وقت ابھری جب ماں کے چہرے پر اطمینان کا تاثر ابھرا۔
اب جب کہ اتنے موسم عمر کے ان کے بنا بیت چکے اور کونپلیں تناور درخت بن چکیں تو ہارون ربانی

اپنے مقناطیسی وسائل کے میدان میں انہیں اپنے مدار میں کھینچ لینا چاہتے تھے۔

فوزان کے ہاتھوں کی مٹھّیاں بھنچ گئیں اور پھر کچھ لمحوں بعد اس کی انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے متحرک ہو چکی تھیں۔

''محترم والد صاحب! میرا اور آپ کا تعلق نہ کسی انسان کے بنانے سے بنا اور نہ کسی کے جدا کرنے سے جدا ہوگا۔ یہ ابدی ہے، جیسا کہ ہمارا رب، محض اسی رب کے احکامات کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ آپ کو والد کہوں اور آپ کی توقیر کروں اور میری ماں اور میری بہن اور میری اپنی جڑیں الحمدللہ آپ کے بنا بھی خوب تناور ہو کر پھل پھول چکی ہیں۔ بہتر ہے آپ ہماری دنیا میں دخل اندازی ختم کر کے ہم کو اس راستے پر چلنے دیں جس کی پاداش میں میری ماں کو مجرم ٹھہرایا گیا تھا اور ہمیں ہارون ربانی کی موجودگی باوجود دنیا مسکین سمجھتی تھی۔ فقط بن امینہ۔''

لمحوں میں ملنے والے اس برقی جواب کو سمندر پار بیٹھے ہارون ربانی نے ایک بار نہیں کئی بار پڑھا اور ہر بار دل سے اٹھنے والے دھوئیں نے آنکھیں دھندلا دیں۔ کیا المیہ تھا وہ اولاد رکھتے ہوئے بھی بے اولاد تھے۔ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو لاچار مان چکے تھے۔ شخصیت رکھتے ہوئے بھی ٹھکرائے گئے تھے۔ وسائل کے انبار کے باوجود تہی داماں تھے۔

اسی وقت ان کے کمرے میں سنہری بالوں والی دوشیزہ داخل ہوئی۔ اس کی کلائی میں وہ بریسلٹ تھا جس کی قیمت ہزاروں ڈالر میں ہارون ربانی نے ادا کی تھی۔ جس کا ایک ایک نگینہ بیش قیمت تھا۔ چاہے اس کے بدلے اس دوشیزہ کو کچھ بھی قیمت دینی پڑی مگر وہ خوش تھی۔ ہارون ربانی نے بڑی اجنبی نگاہوں سے اسے دیکھا، قدرت کی صناعی کا اعلیٰ نمونہ وہ بے شک تھی لیکن پاکیزگی کا وہ ہالہ جو برسوں قبل ان کے نکاح میں آنے والی عورت سے لپٹا تھا اس کے وجود میں وہ مفقود تھا۔ وہ خوشبو جو دور دیس میں رہنے والی ان کی خوابگاہ میں موجود منکوحہ سے پھوٹتی تھی وہ کہیں کسی حسینہ کے قرب میں نہ ملی۔ اعترافات کی لمبی فہرست تھی جو ذہن میں تیار ہو کر دل کو تھکا رہی تھی۔ ہارون ربانی کے لئے مکافات کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ سنہرے بال ان کے چہرے کے اردگرد پھیل کر سحر سا کر رہے تھے لیکن دل کا اضطراب بھی دوچند ہو رہا تھا۔

''رب بڑا بردبار ہے، انسان بردبار نہیں بنتا تو

بے حیا بھی نہ بنے۔'' امینہ کا کبھی کا کہا جملہ ان کے کانوں میں گونجا جیسے کوئی سویا ہوا جاگ اٹھا ہو۔اور پھر ایک سسکاری تصور میں ابھری جو امینہ کے جملے پر ان کا تشدد بھرا ردعمل تھی۔انہوں نے بیوی کی کلائی موڑ دی تھی۔

یادوں کی سزا سے فرار ہونے کے لئے ہارون ربانی نے بغاوت کی سرحدوں میں مزید پیش قدمی شروع کردی۔ سنہرے بال پھیل رہے تھے۔ خوبصورت وجود سے اٹھنے والی مسحورکن خوشبو ان کے ساتھ تھی لیکن وجود پھر بھی جل رہا تھا۔ یہ کیسا انجام تھا اور یہ کیسا آغاز تھا جہاں نرا سراب ہی سراب اور گھاٹا ہی گھاٹا۔ان کی آنکھوں سے گرم پانی نکلا تو حسینہ نے بدمزہ ہو کر فاصلہ کرلیا۔'' اتنے دلکش لمحات میں قنوطی بڈھوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔'' اسکے جملہ پر ہارون ربانی کا قہقہہ بہ مشکل نکلا اور زندگی وہیں سے جوڑنے کی سعی شروع ہوگئی جہاں فوزان کے پیغام سے قبل تھی۔ حالانکہ مدار سے ان کا سیارہ نکل چکا تھا۔اب مصنوعی سیارے تھے۔کھوکھلی ہنسی...... لغوخوشی اورعبث نتیجہ!

کون ہے جو سمجھے......کون ہے جو جانے!

شکست کی رتھ پر سوار ہارون ربانی اپنے آپ کو کتنا بھی فاتح تصور کرے، بہرحال ان کی بظاہر روشن زندگی کے تعاقب میں اڑتی خاک اور گدلے سائے ہی رہ گئے تھے۔اب فقط باتیں ہی تھیں روشنی کی اور قصے ہی تھے فقط اجالوں کے، زندگی کا چراغ جس طاق پر لودیتا، وہ کہاں تھا؟؟ الہامی ہدایات کے فانوس کو خاطر میں نہ لانے پر منظر سے پس منظر تک بس حیرانی ہی حیرانی اور وجود سے لپٹتی تنہائی رہ جاتی ہے۔ چاہے وہ ست رنگے شہر کے باسی ہوں، ہردم اڑتی تتلیاں ہوں......بس ہردم سراب ہی سراب اور ہر لمحہ پیاس ہی پیاس۔اصل کامیاب وہی ٹھہرتے ہیں جو سراج منیر کی جانب پلٹ آتے ہیں ٹھٹک کر کھڑے نہیں رہ جاتے، اکڑ کر تن نہیں جاتے......ان کا نام کچھ بھی ہو، وہی فتح کی رتھ پر سوار ہوتے ہیں۔

(ختم شد)

☆☆☆

حمیرا خالد

ام المومنین

حضرت صفیہؓ بنت حُییؓ

ام المومنین حضرت صفیہؓ بنت حییؓ حضرت ہارونؑ کی اولاد سے تھیں۔ ماں کا نام بَرّہ تھا۔ (عرب میں جو مال غنیمت فاتح سردار کے حصہ میں آئے وہ صفیہ کہلاتا ہے) ان کا اصل نام زینب تھا۔ 14 برس کی عمر میں حضرت صفیہؓ کی شادی ایک مشہور اور نامور شہسوار سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی۔ لیکن دونوں میں بن نہ آئی۔ سلام بن مشکم نے طلاق دے دی۔ اس کے بعد ان کے والد نے ان کا نکاح قریظہ کے ایک مقتدد سردار کنانہ بن ابی الحقیق سے کر دیا۔

خیبر کی جنگ میں حضرت صفیہؓ کے خاندان کے سارے افراد میدان جنگ میں مارے گئے یا جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ مقتولوں میں ان کے باپ بھائی اور شوہر بھی تھے۔ سیدنا حضرت بلال حبشیؓ حضرت صفیہؓ اور ان کی ایک رشتہ دار بہن کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں لائے جب کہ مالِ غنیمت جمع کیا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ نہایت قابل رحم حالت میں تھیں کہ اپنے محبوب والد بھائی اور شوہر کی خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاشیں سامنے تھیں۔ حضرت صفیہؓ نے حسرت سے ان لاشوں پر نظر ڈالی اور کمال صبر سے چپ کی چپ رہ گئیں۔ جبکہ بہن شدت غم سے بے قابو ہوئے جا رہی تھی۔

سرکارؐ دوعالم اس گریہ زاری سے متاثر ہوئے اور حضرت بلالؓ سے مخاطب ہوکر فرمایا: ”بلالؓ تمہارے دل میں رحم نہیں ہے کہ ان عورتوں کو اس راستے سے لائے جہاں ان کے باپ بھائی خاک وخون میں لت پت ہیں۔“

جب مال غنیمت کی تقسیم ہونے لگی تو بعض صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! صفیہ بنونضیر کی رئیسہ ہیں۔ خاندانی وقار ان کی شکل وصورت سے عیاں ہے۔ وہ ہمارے سردار یعنی سرکارؐ دوعالم کیلئے موزوں ہیں۔ حضورؐ نے مشورہ قبول فرمالیا اور حضرت صفیہؓ کو آزاد کر دیا۔ اور انہیں یہ اختیار دیا کہ چاہے تو اپنے گھر چلی جائیں یا پسند کریں تو آپؐ کے نکاح میں آجائیں۔

حضرت صفیہؓ نے حضورؐ کے نکاح میں آنا پسند کیا

اور یوں صہبا کے مقام پر رسم عروسی اور دعوت ولیمہ ہوگئی۔ حضرت صفیہؓ کی عمر اس وقت 17 برس کی تھی۔

ان کے نکاح کے بعد یہودی پھر مسلمانوں کے خلاف کسی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے۔

حضرت صفیہؓ نہایت حلیم الطبع، خلیق، کشادہ دل اور صابرہ خاتون تھیں۔ ایک دفعہ حضورؐ کسی بات پر آپ سے ناراض ہوگئے۔ حضرت صفیہؓ حضرت عائشہؓ کے پاس گئیں اور کہا ''آپؓ جانتی ہیں کہ میں اپنی باری کسی چیز کے معاوضہ میں نہیں دے سکتی، لیکن آپ سرورِ عالمؐ کو مجھ سے راضی کر دیں تو میں اپنی باری کا دن آپؓ کو دے دیتی ہوں۔''

چنانچہ حضرت عائشہؓ نے تمام واقعہ حضورؐ کو سنایا تو آپؐ حضرت صفیہؓ سے راضی ہوگئے۔

حضرت صفیہؓ نے اسلام میں داخل ہونے کے بعد علم و عمل دونوں میدانوں میں خوب محنت کی اور بڑا درجہ پایا۔

آنحضورؐ نے جب یہودیوں کی مسلسل خباثتوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کیا تو یہود بڑی رعونت سے لشکر اسلام کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ نوجوان صفیہؓ کے دل میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ خاندان کی محبت ایک جانب تھی اور حقیقت صداقت کا اعتراف دوسری جانب۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ حق ہی غالب آئے گا اور ان کے والد اور قبیلہ یقیناً شکست سے دوچار ہوں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔

آنحضورؐ کو عظیم الشان فتح ملی۔ بہت سے یہودی جنگجو مارے گئے اور جو بچ گئے وہ غلام بنا لیے گئے۔

علم و فضل میں ام المومنین حضرت صفیہؓ کا بہت بلند مرتبہ تھا۔ کوفہ کی عورتیں اکثر ان کے پاس مسائل دریافت کرنے آتی تھیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت صفیہؓ کی ایک لونڈی نے امیر المومنینؓ سے شکایت کی کہ ام المومنینؓ میں تو ابھی تک یہودیت کی بو پائی جاتی ہے کیونکہ وہ اب بھی ہفتہ کے دن کو مقدس جانتی ہیں اور یہودیوں سے دلی لگاؤ رکھتی ہیں۔ حضرت عمرؓ احوال معلوم کرنے کیلئے خود ام المومنینؓ کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے بتایا کہ جب سے خدا نے مجھے سبت کے بدلہ جمعہ عنایت فرمایا ہے تب سے مجھے ہفتہ کو دوست رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ہاں یہودیوں سے بیشک مجھے لگاؤ ہے کہ وہ میرے قرابتدار ہیں اور مجھے صلہ رحمی کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ آپ کی حق گوئی سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد حضرت صفیہؓ نے لونڈی کو بلا کر پوچھا کہ ''تجھے میری شکایت کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟''

اس نے کہا ''مجھے شیطان نے بہکایا تھا۔''

ام المومنینؓ نے فرمایا ''جا میں نے تجھے آزاد کیا (راہ خدا میں)

آنحضورؐ ان سے بہت زیادہ حسن سلوک کیا کرتے تھے کیونکہ ان کا خاندان قتل ہو چکا تھا۔ آپؐ ان کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور ان سے ہمدرد ی رکھتے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ام المومنین حضرت صفیہ کو ان کے پست قد ہونے کا طعنہ دیا تو حضورؐ نے فرمایا عائشہؓ تم نے آج ایسی بات کہہ دی کہ اگر یہ سمندر میں جلا دی جائے تو سارا سمند اس کے اثر سے کڑوا ہو جائے۔

آنحضورؐ ان کا بہت زیادہ خیال کیا کرتے تھے بلکہ دلجوئی کیا کرتے۔

ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے انہیں بنتِ یہودی کہہ کر مخاطب کیا تو حضرت صفیہؓ کو یہ ناگوار گزرا حضورؐ سے شکایت کی۔ آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ تمہیں کہہ دینا چاہیے تھا کہ بی بی سنو! میرا شوہر محمدؐ ہے، میرا باپ ہارونؑ اور میرا چچا موسیٰؑ کلیم اللہ ہے۔

حضرت صفیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ سے بڑھ کر حسن اخلاق کا نمونہ نہیں پایا۔

حضرت صفیہؓ کو سرورؐ عالم سے بے انتہا محبت تھی۔ جب مرض الموت میں تمام ازواج حضورؐ کی عیادت کیلئے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لائیں تو حضرت صفیہؓ سے حضورؐ کی بے چینی دیکھی نہ گئی عرض کیا، یارسولؐ اللہ! کاش آپ کی بیماری مجھے ہو جاتی۔

دوسری ازواج نے ان کی طرف دیکھا۔ تو حضورؐ نے فرمایا واللہ وہ سچی ہے۔ یعنی ان کا اظہار عقیدت نمائشی نہیں بلکہ سچے دل سے ہے۔

ام المومنین حضرت صفیہؓ بے حد درد مند، صابر اور حسین خاتون تھیں۔

قبول اسلام کے بعد یہودیت کا طعن حضرت صفیہؓ کے لئے بڑی دلآزادی کا باعث ہوتا تھا۔ لیکن نہایت صبر وتحمل سے کام لیتیں اور کبھی کسی کو سخت جواب نہ دیا کرتیں۔

حضرت صفیہؓ نے رمضان المبارک 50 ہجری میں 60 سال کی عمر میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ انہوں نے اپنا ذاتی مکان اپنی زندگی میں ہی راہ خدا میں دے دیا تھا۔ البتہ ترکہ میں ایک لاکھ درہم نقد چھوڑے، اور اس کے ایک تہائی کی وصیت اپنے یہودی بھانجے کیلئے کی جو بعد میں پوری کی گئی۔

☆☆☆

اختلاف کے باوجود

آپ نے دیکھا کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بدامنی اور دہشت گردی کی روک تھام کے لئے بالآخر ''مذاکرات'' کی راہ نکالی گئی۔ یہ بدامنی محض ملکی سطح تک محدود نہیں رہی ہے۔ ہر خاندان، ہر گھر اس کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ یہ الجھنیں، مسائل، یہ بے رخی، یہ عدم تعاون، یہ حکم عدولی، یہ نفرت، یہ عداوت، یہ رقابت......اگر شروع ہو جائے تو بڑھتی ہی رہتی ہے۔ جب تک ایک دن فریقِ ثانی کو پکڑ کر سامنے نہ بٹھا لیا جائے اور کہا جائے کہ ''بتاؤ'' کیا بات ہے، کیوں اکھڑے اکھڑے ہو، کیوں گولہ بارود سے باتیں کر رہے ہو، کیوں جینا حرام کیا ہوا ہے، کیوں راتوں کو سونے نہیں دیتے، کیوں سکون سے جینے نہیں دیتے، کیوں ہمیں پنپنے نہیں دیتے، آخر تمہیں چاہیے کیا......؟؟

اللہ نے اس دنیا کو مختلف چیزوں سے سنوارا ہے...... پانی ، ہوا، دھوپ، چھاؤں، کانٹے ، پھول، دریا، پہاڑ، جنگل، وادی...... سب میں اختلاف ہے۔ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ زمین میں سمندر اور دریا ہیں تو آسمان پر ستارے اور سیارے ہیں۔ لیکن اس اختلاف کو انہوں نے مخالفت نہیں بنایا۔ اس اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں (جیسے ایک اندھا اور ایک لنگڑا ایک دوسرے کی آنکھیں اور ٹانگ بن جاتے ہیں۔ اندھا لنگڑے کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ہے، لنگڑا راستہ بتاتا رہتا ہے اور اندھا چلتا رہتا ہے۔)

بادل پانی کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھتے ہیں اور ہوا بادلوں کو اٹھائے پھرتی ہے۔ پھر جہاں اللہ چاہتا ہے ان کے اشتراک سے بارش برسا دیتا ہے۔ زمین بھبک اٹھتی ہے۔ سیراب ہو جاتی ہے، زرخیز ہو جاتی ہے، سبزہ لہک اٹھتا ہے، حسن نکھر اٹھتا ہے۔ اللہ نے انسانوں کو زمین پر فساد کرنے کے لئے نہیں بھیجا۔ اس نے تو اسے امن قائم کرنے کے لئے بھیجا ہے، محبت اور اخوت قائم کرنے کو کہا ہے۔ یہ اختلاف شکل

وصورت، قدوقامت کا اس نے شناخت کے لئے رکھا ہے۔ آپ اپنے پانچوں بچوں کو ایک ہی نام سے تونہیں پکار سکتے۔ آپ طشتری، رکابی، پیالہ، ڈونگا، دیگچی، توا، کڑاہی کو صرف برتن تونہیں کہہ سکتے۔ انسانوں کو رشتے کی ڈور میں باندھ کر خاندان بنایا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، سب کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت ڈالی ہے۔ ایک کو ذرا تکلیف ہوئی دوسرا بے چین ہوا۔ ایک کو ذرا سکھ ملا، سب کے چہرے کھل گئے۔

ماں باپ کا کردار بچوں کے کردار سے مختلف ہوتا ہے، ان کی ذمہ داریاں دوسری ہوتی ہیں، بچوں کی دوسری...... ان کی دلچسپیاں، مشاغل، احباب، وضع قطع ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان میں ایک دوسرے میں مخالفت نہیں ہوتی۔ اختلاف کو مخالفت بنا کر رنجش کی بنیاد رکھنا، غلط فہمی کو پروان چڑھانا، بدگمانی کو ہوا دینا، فاصلوں کو بڑھانا، بے رخی اختیار کرنا، بے مروتی اختیار کرنا، اور بالآخر ایک دوسرے سے لاتعلق ہوجانا، کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔

آپ کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں اور بھنڈی گوشت دیکھ کر آپ کی بھوک ہی اڑ گئی ہے کیونکہ آپ کو بھنڈی گوشت ناپسند ہے۔ اب یا تو آپ انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف شوربے اور گوشت میں روٹی کھالیں یا پھر پکانے کی پلیٹ پکانے والے کے سر پر دے ماریں کہ اس نے بھنڈی پکائی ہی کیوں!! اب بچہ محنت کے باوجود اتنے نمبر نہیں لا سکا جتنے آپ چاہتے تھے تو آپ اس کا کالج میں ایڈمیشن ہی نہ کروائیں، زندگی بھر اس کی صورت نہ دیکھیں، اس سے بات نہ کریں......اب آپ کو صبح کریم کلر کا سوٹ پہننا تھا بیگم نے گرے کلر کا استری کر دیا، صبح صبح اس بات پر گھر میں فساد برپا کر کے چلے گئے......اب آپ کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں، بات چیت، ہنسی مذاق ہو رہا ہے کہ دفعتاً آپ نے ایک بات پکڑ لی اور محفل سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ایسا کیوں کہا، اور اس کہے کو (آپ پلو سے تو کیا باندھیں گے) دل میں گرہ بنا کر رکھ لیتے ہیں...... کوئی معذرت، کوئی معافی قبول نہیں کرتے......بس لگ گئی تو لگ گئی......اب نہ ہم ان کے گھر جائیں گے نہ وہ ہمارے گھر آئیں گے......

آج کل انداز حیات یعنی لائف اسٹائل کچھ ایسا ہوگیا ہے کہ ہر آدمی اپنی دنیا میں مگن ہے......اماں ہیں تو انہیں اپنے لباس، اس کی تراش خراش، اسکی سجاوٹ

بناوٹ ......نئی نئی ڈشز کی تلاش ......اور تلاش کے بعد اس کے لوازمات کی فکر...... سہیلیوں سے گپ شپ، بہنوں کے مسائل، خاندانی جوڑ توڑ، موبائل اوراسکائپ...... ابا ہیں تو دن میں آفس اور شام کو نیوز چینل...... بچے ہیں تو ان کی مشغولیات، ان کی دلچسپیاں، ان کے دوست احباب، ان کے لیپ ٹاپ، ان کی ذاتیات...... یعنی ایسا ہے کہ ایک دوسرے کی زندگی میں ایک دوسرے کو جھانکنے کی نہ فرصت ہے اور نہ یہ تانکا جھانکی پسند کی جاتی ہے......بس فاصلہ پسند کیا جانے لگا ہے۔

''ارے بھئی کیا ہے آپ کو؟ آپ کو کیا پتہ! بھئی سکون سے جینے دیں، یہ ہر بات میں روک ٹوک، ہر کام میں عمل دخل، ہم کیا دنیا میں جی نہیں رہے؟ بس تم میرے ہر کام میں ٹانگ نہ اڑایا کرو......کیا کر رہا ہوں، جا رہا ہوں، کسی سے بات کر رہا ہوں، اپنے کام سے کام رکھو اور بس......''

اس طرح وہ توقعات بھی پوری نہیں ہو پا رہیں جو ہم ایک دوسرے سے رکھتے ہیں کہ اداس ہیں تو کوئی سبب پوچھے، بیمار ہیں تو کوئی تیمارداری کرے، گر جائیں تو کوئی سہارا دے، ساعت کمزور ہو جائے تو کوئی بات دہرا دیا کرے، کوئی الجھن ہو تو سلجھا دے، ساتھ بیٹھے، ساتھ چلے...... اس انفرادی طرزِ حیات کے باعث بہت سی غلط فہمیاں آپس میں پیدا ہو جاتی ہیں......فاصلوں کی وجہ سے، عدم فرصتی کی وجہ سے۔ یہ غلط فہمیاں اختلاف کا باعث بن جاتی ہیں، رنجش کے باعث بن جاتی ہیں، ترکِ تعلق کا باعث بن جاتی ہیں۔

جب گھر میں ایسی فضا قائم ہو جائے تو مذاکرات ناگزیر ہو جاتے ہیں۔مل بیٹھئے...... باتیں کیجیے......دل کی گرہ کھولیے...... امن قائم کیجیے...... اخوت قائم کیجیے۔ذرا اپنے ہاتھ کی طرف دیکھئے...... پانچوں انگلیاں برابر ہیں؟؟ ایک ہی ہاتھ میں ہونے کے باوجود ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔کوئی انگلی چھوٹی ہے کوئی بڑی اور انگوٹھا تو انگلی سے بالکل مختلف ہوتا ہے، دوسرے رخ پر...... لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود پانچوں انگلیاں ایک دوسرے سے معاون و مددگار رہیں، ایک دوسرے کی قوت ہیں۔

جب ہاتھ گلاس پکڑنا چاہتا ہے تو پانچوں حلقہ بنا لیتی ہیں، انگوٹھا مخالفت کرتے ہوئے الگ نہیں ہو جاتا، اگر وہ ایسا کرے تو ہاتھ کے لئے گلاس تھامنا ناممکن ہو جائے۔ جب ہاتھ مصافحہ کیلئے آگے بڑھتا ہے

تو انگلیاں مخالفت کرتے ہوئے مٹھی بند نہیں کرلیتیں...... جب ہاتھ دعا کے لئے اٹھنا چاہتا ہے تو ایک دوسرے سے اختلاف رکھنے کے باوجود تمام انگلیاں منظّم ہو جاتی ہیں، متحد ہو جاتی ہیں۔ جب ہاتھ قلم تھامنا چاہتا ہے تو سب انگلیاں تعاون کرتی ہیں (ہاں یہ ہاتھ اگر کسی کی طرف انگلی اٹھاتا ہے تو دوسری انگلیاں اپنا سر جھکا لیتی ہیں) جب ہاتھ کسی کو تھپڑ رسید کرتا ہے تو انگلیوں کے اتحاد کے باعث تھپڑ میں وہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ اپنا نشان چھوڑ جائے......

اختلاف ضرور رکھیے کہ زندگی کی رنگا رنگی برقرار رہے۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے ہی کوئی تصویر دیدہ زیب اور خوشنما لگتی ہے۔ مگر اسے مخالفت کا رنگ دے کر زندگی کو بدرنگ نہ کیجیے۔

☆☆☆

رخسانہ اقبال راؤ

وفا کی پیکر

روٹی، کپڑا اور مکان تو مہیا کر دیا گیا، اب وہ اشرف المخلوقات بننے کی کوشش تو نہ کرے! بن بلائے مہمان کا قصہ

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ شاید میں آپ کو وفا شعار بیوی کے بارے میں لیکچر دینے لگی ہوں یا لیلیٰ مجنوں کا کوئی قصہ سنانے جارہی ہوں۔ نہیں جناب! آج بات ذرا ہٹ کے ہوگی۔

دوسری جماعت سے پڑھتے آرہے تھے کہ کتا ایک وفادار جانور ہے۔ پھر پطرس بخاری نے بھی کتوں کو بڑی اہمیت دی مگر آپ کو علم حیاتیات کے اس جانور سے متعارف کرانا چاہوں گی جس کے بارے میں میری ناقص معلومات میں حال ہی میں اضافہ ہوا ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ سامنے والے گھر میں چوری کا سنا تو میں بھی پتہ کرنے گئی۔ کچھ عجیب سی واردات تھی۔ دن دہاڑے چور تالا توڑ کے اندر آیا۔ دونوں میاں بیوی ملازمت سے شام کو آتے ہیں۔ یقیناً چور کو معلومات تھیں اور وہ کوئی ذہین نوجوان معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے انتخاب میں صرف لیپ ٹاپ اور کیمرہ وغیرہ ہے۔ خیر ہم نے اپنی ہمسائی کو بچ جانے والی چیزوں پر شکر گزاری کا احساس دلانے کی کوشش کی، جبکہ اکثر خواتین افسوس کر کے حزن وملال میں اضافہ کر رہی تھیں۔

جب میں واپس آئی تو ایک بلی جوان کے گھر بڑی دیر سے میرے قریب بیٹھی تھی میرے پیچھے ساتھ ہی چلی آئی۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا تو انکشاف ہوا کہ یہ وہی بلی ہے جسے صبح میں نے بچا کھچا کچھ کھانا ڈال دیا تھا اور جاتے وقت بھی یہ میرے ساتھ ہی تھی۔

واہ کیا عجب انداز ہے دوستی کا! گیٹ سے اندر بھی آ گئی۔ میرا چھوٹا بیٹا تو ویسے ہی پرستار ہے قدرت کی اس حسین تخلیق کا۔اور اس حق میں نہیں کہ جب دروازے سے اندر کوئی بلی داخل ہو جائے تو اسے نکال باہر کیا جائے۔ بیٹے کی محبت اور نہ پڑھنے کی دھمکی کی وجہ سے مجھے بھی اس رقیب روسیاہ کو گوارا کرنا پڑا۔ ویسے میں بھی بلیوں کی دشمن نہیں مگر جب وہ زیادہ ہی فری ہوتی ہیں تو یہ بات چنداں نہیں بھاتی...... مثلاً موقع پا کر اندر بیڈروم میں مداخلت کی کوشش اور پھر نرم کمبل میں بسیرے کی جرأت۔ حالانکہ صحن میں اسے تمام

چیزیں مہیا کردی گئی تھیں۔یعنی روٹی کپڑا اور مکان۔ بھئی اب اشرف المخلوقات بننے کی کوشش تو نہ کرے!

اور سب سے اہم بات کرسی پہ قبضہ! گویا انہیں بھی امیری، وزیری کا فہم ہو۔ زمین پر کم ہی ٹکتی ہیں۔عموماً اونچی جگہ پر بیٹھنے کی کوشش ہوگی۔کبھی گیٹ کے ساتھ ستون پر کبھی درخت پر چڑھی اپنی بٹن جیسی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے باور کرائے گی کہ''نکال کے دیکھو مجھے!'' شام کو فارغ ہو کے لان میں پڑی کرسی پر بیٹھنے آؤ تو محترمہ براجمان! اور اس سے بڑھ کر یہ کہ صبح صبح چائے بنا رہی ہوں، قہوہ ابل رہا ہے، دودھ کا انتظار ہے مگر کیا دیکھتی ہوں کہ میاں صاحب پہلے ہی کچھ دودھ بلی کے پیالہ میں انڈیل رہے ہیں۔اب ہے یہ غصہ کی بات! اگرچہ غصہ حرام ہے......اور میں نے اس کو گیٹ سے باہر دور بھیج دیا۔

ظہر کے وقت خبر ملی کہ مسجد میں جب جماعت ہو رہی تھی تو ایک بلی نمازیوں کے آگے دندناتی پھر رہی تھی اور پھر اس نے اللہ کے گھر میں اتنے نمازیوں کا سروے کر کے چہرہ پہچان لیا۔لہٰذا بیٹا جب گھر آیا تو اس کے پیچھے دم ہلاتی وہ بھی دوبارہ آن وارد ہوئی۔

چند روز پہلے امی ابو تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ ہمارا تو ایک بلے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ روزانہ گھر میں دھما چوکڑی مچا کے جاتا ہے۔حد تو یہ ہے کہ جب ڈانٹ ڈپٹ سے بڑھ کر اسے ڈنڈا دکھایا تو بیڈ پر نجاست کر گیا۔اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر تو اکثر ہی انتقامی کارروائی ہوتی ہے۔

اُف! یہ مجال......اتنی بدمعاشی......میں حیران رہ گئی کہ جائز حقوق نہ ملنے پر یہ نسل بھی احتجاج کرنا جانتی ہے۔شکر ہے ان کی کوئی تنظیم نہیں ورنہ حضرتِ انسان کا کیا بنتا!!

اب احساسِ تشکر سے دل لبریز ہو گیا کہ ہماری بلی کتنی شریف ہے۔

رویے میں نرمی سے بیٹے نے پورا فائدہ اٹھایا اور اگلے ہی روز اس کا دوست ایک نومولود''لاوارث'' بلی اسے تھما گیا۔یعنی یک نہ شد دو شد۔

ایک دن موبائل پر شہناز عاصمہ کے ڈھیر سارے پیغامات دیکھے تو اخبار کے اداریے پڑھنے کیلئے نیٹ آن کیا۔ زرداری صاحب صدارت سے فارغ ہو چکے تھے۔ اچانک سوجھا کہ سابق صدر کے حالات ومعمولات سے بھی کچھ واقفیت حاصل کی جائے۔ چنانچہ گوگل پر ایک دن جیو کے ساتھ میں زرداری کی صبح

کا آغاز دیکھا کہ وہ ناشتے میں اپنی بلی کو چپس کا پیکٹ کھول کر پیش کرتے ہیں اور نہایت احترام سے اسے ''بلی جان'' کہہ کے مخاطب کرتے ہیں۔ واہ رے زرداری! احترامِ آدمیت تو آپ نبھا چکے،اب حیوانات سے ہی دل بہلائیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی چھوٹی نئی بلی کی! بڑی بلی جو اپنے آپ کو اب بلا شرکتِ غیرے اس گھر کی مالکن سمجھتی تھی اس نے غرا کر اسے آنکھیں دکھائیں۔قریب تھا کہ اسے مار ڈالتی مگر اسے مسیحا نے جھٹ سے سنبھالا اور بڑی کو چپت رسید کی۔ اب اس کے قیام وطعام کا بندوبست کیا گیا اور چند دنوں میں دونوں اتنی مانوس ہوگئیں کہ بڑی والی بہن کی طرح چھوٹی کو اپنی آغوش میں سلانے لگی۔

واہ رے مولا! تیری قدرت کے کرشمے۔ بے زبان جانور بھی کتنا سمجھ دار ہے۔

آخر ہمیں بھی اس متبنّٰی کو تسلیم کرتے ہی بنی۔

☆☆☆

آسمان تیری لحد پہ......

لوگ دسمبر کی شاموں میں اداس پھرتے ہیں مجھے جنوری کی صبحیں ویران کرتی ہیں 9 جنوری 14 جنوری 29 جنوری یہ میرے دل میں بسنے والی دادی اماں، میرے چچا اور میرے ابا جی کی جدائی کی تاریخیں ہیں جنوری شروع ہوتا ہے میرے دل کی دنیا سوگوار ہو جاتی ہے۔ ابھی جنوری کا ایک ستم باقی تھا اور 6 جنوری بھی جانے والوں کی یادگار بن گیا، قاضی حسین احمد (مرحوم) کی جدائی کا دن......

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

......اوپر والا پیراگراف میں نے فروری 2013ء کے قاضی حسین احمد کی یاد میں شائع ہونے والے بتول کے مضمون ''مقام دیگر عاشقی'' کے لئے تحریر کیا تھا۔ آج میرے نظروں سے یہ دوبارہ گزرا۔ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے وہی اس کے ساتھ پیش آتا ہے۔ 2014ء کے جنوری نے تو مجھے وہ ستم دیا کہ میرا وجود پھوڑا بن چکا ہے۔ میرے ہر سانس کے ساتھ میری ماں کی یاد میں اک آہ باہر آتی ہے۔ میرا دماغ سن ہو چکا ہے۔ میں بے بسی سے رونے لگ جاتی ہوں تو 11ھ کا ایک غم ناک دن تاریخ سامنے لاتی ہے جب محبوبؐ خدا آقائے نامدار کا جسد خاکی سامنے پڑا ہے اور سیدہ فاطمہؓ کہتی ہیں' ہائے کوئی جبرائیلؑ کو خبر کر دے......آج مجھ پر وہ غم آن ٹوٹا ہے کہ سورج پر پڑے تو صدمے سے وہ بھی سیاہ ہو جائے'۔

میرا رونا تھم جاتا ہے۔ میں آنسو پونچھ کر انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد کرنے لگ جاتی ہوں۔ 5 جنوری سے آج 22 جنوری تک روز میرا دل ماں کی یاد میں غمزدہ ہوتا ہے۔ روز ہی میرا غم آنسو بن کر بہہ نکلتا ہے اور روز ہی تاریخ میں صبر کا کوئی واقعہ میرا دامن تھام لیتا ہے۔

جنوری 2014ء کی دوپہر بارہ بج کر پینتیس منٹ پر امی کی گردن پر بے تحاشا پسینہ تھا۔ میں وکس سمجھ کر پونچھتی رہی اور مجھے خبر ہی نہ تھی کہ یہ میری ماں کی زندگی میں بہنے والا آخری پسینہ ہے۔ زندگی بھر کی مشقتیں، ریاضتیں سب اسی پسینے میں بہہ گئیں۔ اب ان شاءاللہ

العزیز میری ماں سے ستر گناہ زیادہ پیارا رب ان کی میز بانی کرر ہا ہوگا۔ زندگی بھر بھی اور بیماری کے دوران بھی وہ ''میں رب کی رضا پہ راضی ہوں'' کا اقرار کرتی تھیں۔ مجھے پورا یقین ہے رب کی رضا کا انھوں نے چشم دید مشاہدہ کرلیا ہوگا۔ وہ جنت کی بہت مشتاق تھیں۔ان کی قبر کو میرے رب رحیم نے جنت کی کھڑ کی بنادیا ہوگا! رب کی طرسے ملنے والے انعامات کو پا کر ان کا چہرہ کس قدر گلنار ہوگا......اپنے بچھڑ جانے والے پیاروں سے (ان شاءاللہ) مل کر وہ کس قدر چمک اور چہک رہی ہوں گی...... اس کا تصور ہی مجھے سکینت دیتا ہے۔ دراز قد، سیاہ لمبے گھنے بال، خوش مزاج وخوش خصال......سعیدہ طاہرہ...... بہت عرصہ تک وہ ہمارے لیے بھی سب لوگوں کی دیکھا دیکھی ''آپا جی'' رہیں۔ جب تک وہ زندہ تھیں ماں بن کر ہمارے اردگرد موجود رہتیں۔ان کا فون آیا ہے۔انھوں نے یہ کہا ہے۔ان کو بہت درد ہوتا رہا ہے رات بھر، ان کی ٹانگ کی ہڈی کا فریکچر ہوگیا ہے، بسا اوقات وہ کئی کئی گھنٹے نظروں اور یاد سے بھی اوجھل رہتیں۔ سارادن بے پناہ مشقت اورمصروفیت میں گزار کر رات ہوجاتی۔جسم کا جوڑ جوڑ درد کرر ہا ہوتا اور میں جب اس شعر کو ذہن میں حاضر کرتی تو اچانک چھم سے وہ میرے سامنے آجاتیں۔ ارے آج امی سے فون پر بات ہی نہیں ہوئی۔اس سے پہلے کہ میں ریسیور اٹھاتی بیل بجنے لگتی۔سلام دعا کے بعد فوراً معذرت کرتیں کہ میں تمہیں آج فون نہ کرسکی، دن کیسے گزرا۔شعر کی بات بیچ میں ہی رہ گئی جو ماں کی یاد دلاتا تھا۔

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

اب جب کہ وہ سارے غم سینے سے لگائے اس دنیا کو چھوڑ چکی ہیں تو مجھ پر عجیب انکشاف ہوا ہے میری امی، میرآ پا جی تو اب میرے اردگرد نہیں میرے دل میں آن بسیں ہیں۔آج یہ سطور تحریر کرتے ہوئے ان کو رخصت ہوئے پچیسواں دن ہے۔ان پچیس دنوں میں سوتے جاگتے کروٹ تک بدلتے ہوئے میں نے انہیں اپنے دل میں پایا ہے۔ایک لمحے کے لئے ان دنوں میں وہ میرے ذہن سے اوجھل نہیں ہوئیں۔ یقیناً ہر ماں کے جانے کے بعد ایسے ہی ہوتا ہوگا لیکن میری ماں مجلس میں خاموشی سے بیٹھنے والی ایک عاجز خاتون تھیں

جنہوں نے موجودگی کا احساس دلانے کی شعوری کوشش کبھی نہیں کی تھی۔اب میں سمجھ پائی ہوں کہ گھن گرج سے بولنے والے بول کر چلے جاتے ہیں۔اصل سرمایہ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔

ذاتی اوصاف کی بات لیں تو میں نے ان کے اندر ایثار کی بے پناہ صفت دیکھی۔ باقی ماؤں کا ایثار صرف اولاد کے لئے ہوتا ہوگا، ان کے لئے مخلوق خدا ہی اولاد سے بڑھ کر تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا گھر میں ایک نہ ایک بچہ یا بچی موجود رہتی۔ اگر بن ماں کی بچی سکینہ ہے تو وہ زندگی کے کئی سال ہمارے گھر میں رہ کر ہمارے گھر کا فرد بنی رہی۔ پھر تو کسی سے باجی کی کلاس فیلو جو جہانیاں سکول میں ہاسٹل نہ ہونے کی وجہ سے لمبا سفر کر کے روزانہ جہانیاں آتی ہے خجل خوار ہوتی ہے تو اسے اپنے گھر میں اس عزت وتکریم سے رکھا کہ اس نے جہانیاں کو اپنا میکہ ہی بنالیا۔ پہلے میٹرک تک سکول کی پڑھائی پھر قرآن کی تعلیم۔ زندگی کے کئی سال گزار کے جب وہ واپس گئی تو وہ ہماری پکی پکی ''باجی ارتفاع'' بن چکی تھی۔ کبھی دوردراز کے گاؤں کا بچہ بگا کنوینس نہ ہونے کی بنا پر گھر میں بطور مہمان رہ رہا ہے تو کبھی الیاس۔ درجن نام ایسے ہیں جو امی کی محبتوں کے اتنے خصوصی حقدار رہے کہ بسا اوقات ہمیں بھی رشک آتا تھا۔ پھر ان محبتوں کے خزانے کھانے پینے میں ہی نہیں لٹائے جاتے تھے بلکہ ان کی دینی تربیت کا بھی پورا بندوبست ہوتا۔ اگر ارتفاع نے ہاسٹل نہ ہونے کی بنا پر میٹرک ہمارے ہاں رہ کر کیا تو اسے میٹرک کے بعد فارغ نہیں کیا۔اس کے بعد دو سال مزید اپنے ہاں رکھا۔قرآن پڑھایا، ترجمہ تفسیر سے پڑھایا۔اوراس انداز سے یہ فرض ادا کیا کہ آج بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو وہ سب سے پہلے امی کو ہی فون کرتی تھیں۔

بتول، عفت، خواتین کا اسلام میں جو تحریر انہیں پسند آجاتی اسے بہت زیادہ تعداد میں فوٹوسٹیٹ کروا کے تقسیم کرتیں آنے والیوں کو پڑھ کر سناتیں۔ جو کتاب پسند آجاتی پھر بجٹ کی پروا کیے بغیر ان لوگوں کو ہدیہ دیتیں جہاں سے امید ہوتی کہ یہ لوگ آگے تقسیم کرنے والے ہیں۔

دل کی بے پناہ غنی تھیں۔ جب خالاؤں، ماموؤں، چچاؤں کی بیٹیاں بھی ہماری طرح گرما کی چھٹیوں میں آتیں اور ملنے کے لئے امی کے پاس آتیں تو امی کے

بس میں نہ ہوتا کس طرح خاطر مدارات کریں۔ خود کر نہ سکتی تھیں معذوری آڑے آجاتی ۔ بیٹیوں سے ویسے ہی شرمندہ رہتیں کہ ماں کے پاس آ کر بھی کاموں میں جت جاتی ہو۔ فوراً پرس سے پیسے نکال کر آئس کریم، قلفی، دہی بھلے، سموسے، گرما گرم جلیبیاں۔ الغرض وہ کھلا کر خوش ہونے والوں میں سے تھیں۔ پانچ سال قبل ڈاکٹرز نے کہا کہ ''ماں جی نے آپ کا معدہ آپ سے ناراض ہوگیا ہے۔'' جواب الجواب ماں جی نے معدہ کو بھلا ہی دیا۔ لذتوں سے منہ موڑ لیا۔

شیخ سعدیؒ یا رومی کی حکایت ہے کہ ایک لڑکا ڈاکوؤں کی صحبت میں شامل ہوگیا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے شمولیت کے لئے یہ شرط عائد کی کہ اپنی ماں کا سر کاٹ کر لاؤ تا کہ ہمیں تمہاری وفاداری کا یقین ہوسکے۔ ماں باپ کے اکلوتے بچے نے ماں کا سر کاٹا ،کاٹ کر تھیلے میں ڈالا اور تھیلا ہاتھ میں لے کر ڈاکوؤں کے سردار کے پاس چل پڑا۔ راستے میں زور کی ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرا۔ قارئین! اس سے آگے کا واقعہ بہت ہی مؤثر ہے سننے اور پڑھنے کیلئے ''جگرا'' چاہیے۔ میری مرحومہ ماں ہمیشہ اگلا حصہ اپنے درس میں شعر کی صورت میں پڑھا کرتی تھیں۔

بیٹا جو گرا تو تھیلے سے ندا یہ آئی
بیٹا چوٹ تو کہیں نہیں آئی؟؟

آج یہ لکھتے ہوئے میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بچپن میں امی کی زبانی یہ واقعہ اتنا سنا کہ منہ پھاڑ کے سوال کرتی۔ افوہ...... آپ یہ کیا ایک ہی واقعہ سناتی رہتی ہیں۔ امی اپنے مخصوص لہجے میں کہتیں۔ ابھی نہیں بیٹا! اس کی کچھ عرصہ بعد میں سمجھ آئے گی۔

میری پیاری امی! آج آپ کی بیٹی کو اس واقعے کی بہت اچھی طرح سمجھ آچکی ہے۔ اس کا لُوں لُوں، بوٹی بوٹی گواہی دے رہا ہے کہ یہ واقعہ سو فیصد سچا ہے۔ لیکن امی...... میری پیاری امی آج آپ کو اپنے پیارے اللہ کے پاس گئے دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ آپ وہ سب مراحل طے کر چکی ہیں جن کے خوف سے آپ کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ آپ کی مناجات اور رونے بلکنے سے آپ کا جائے نماز بھیگ جایا کرتا تھا۔ آپ اس رب کے پاس ہیں جس سے ملنے کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ کپڑے لتے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی رغبت ہی نہ رہی۔ جو ملا کھا لیا، جو دیا پہن اوڑھ لیا۔

امی زاہد خشک نہ تھیں بہت اچھا حس مزاح تھا

اور اباجی کی صحبت میں تو ایک آدھ لفظ سے ہی حس مزاح ٹپک پڑتی۔ ایک دفعہ ذروہ (میری چھوٹی بیٹی) کسی بات پر ناراض ہوگئی اور کمبل میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ بڑی مشکل سے وہیل چیئر پر اس کے پاس گئیں اور کہنے لگیں۔''ذروہ بیٹے ''روس'' جانا ضروری تو نہیں کسی اور ملک کا ویزہ لے لینا تھا۔ یاد رہے کہ پنجابی میں ''رُسنا'' ناراض ہونے کو کہتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ اتنی دوستی تھی کہ سارا سال سکے اور پانچ دس کے نوٹ جمع کرتی رہتیں جب گرما کی چھٹیوں میں ہم سب جہانیاں جاتے تو بچوں کے موج میلے لگتے۔ بچوں کی تربیت کے لئے اتنی فکرمند رہتیں کہ جب بچوں کی فرمائش پر ''نانی اماں، قلفی والا آیا ہے، نانی اماں گول گپے لے دیں'' نانی اماں ان کی خواہشیں سب پوری کرتی تھیں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ آیت الکرسی کون سنائے گا؟ سب سے اچھی نعت کون پڑھے گا؟ درود ابراہیمی کس کس کو آتا ہے؟ کسی لالچ میں ہی سہی بچے ان کی شرط اکثر و بیشتر پوری کر دیا کرتے تھے۔

''صبر'' سہہ حرفی لفظ ہے لیکن اس پر پورا اترنا اور اس کے تقاضے پورے کرنے ہر کس و ناکس کی پہنچ میں نہیں اور بالعموم لوگ میت پر بین نہ ڈالنے کو بھی صبر گردانتے ہیں۔ میری ماں نے بچپن سے صبر کو اپنا ساتھی بنایا اور اللہ نے ان کو اپنا ساتھی بنا لیا۔

ساڑھے چار سال کی عمر میں ماں رخصت ہوگئی۔ بہت چھوٹی عمر میں جس میں صبر کیا ہے اس کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ لیکن آج میں قطعی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ جن کو صبر کی بلند چوٹیوں پر چڑھنا ہوتا ہے اللہ بچپن میں ہی ان کی مائیں لے لیتا ہے۔ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ میں نے اپنے بچپن میں ہر کسی کے چہرے پر اپنی ماں کو ڈھونڈا جب وہ نہ ملی تو میں نے سوچا جن کی ماں نہیں ہے میں ان کی ماں بن جاتی ہوں یوں جب ان کی دوسری امی کا بھی انتقال ہوگیا تو بہن بھائیوں سے اتنا لاڈ پیار کیا ان کی ایسی ایسی خواہشیں، فرمائشیں اور ضدیں پوری کرتی تھیں کہ سگی ماں بھی ہو تو ٹال دے۔ ممتا کی محبتوں کے چشمے تو تبھی سے بہہ نکلے تھے ان کے مرنے کے بعد بھی درجنوں لڑکیاں اور عورتیں اس غم میں رو رہی تھیں کہ یہ تو ہماری ماں تھیں، ان کے پاس آکر غم غلط ہو جاتے تھے۔

صبر کی اس سے بڑی مشکل جوان بچے کی جدائی ہے۔ پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ان میں سے ایک بیٹے کی شادی کو محض تین سال کا عرصہ گزرا تھا، دو سال کی

بیٹی اورایک سال کا بیٹا......وہ سال سے زائد عرصہ بیمار رہنے کے بعد ابدی گھر روانہ ہوگیا۔ ماں نے یہ عرصہ اتنے صبر سے گزارا کہ مثال دی جاسکتی ہے۔ تین عیدیں اس کی بیماری کے دوران مسلسل سی ایم ایچ میں گزاریں۔شوال میں نفلی روزہ رکھا ہوا تھا جب بیٹے کے دم واپسیں کا مرحلہ آیا، کھجور ہاتھ میں تھی۔ روزہ کھول کر اناللہ پڑھی بیٹے کی کھلی آنکھیں بند کرکے مغرب کی نماز کے تین فرض ادا کیے پھر اپنے بڑے بیٹے کو اس کی وفات کی اطلاع دی۔ رات اور وہ بھی سردیوں کی...... رب سے شکوہ شکایت کیا نہ بین ڈالے......رب کی رضا پہ راضی ہونے کا زبانی اقرار ہم جیسے کج فہموں کو حیران کرتا رہا۔ پھر جب بیٹے کی میت اٹھانے کا مرحلہ آیا تو ظہر کے فرض ادا کرنے چلی گئیں کہ اسی وقت بےصبری ہوتی ہے۔ جنازہ اٹھنے کے بعد تمام خواتین کو جوصف پر موجود تھیں دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کا کہا۔ پھر اپنے بیٹے کی مغفرت کے لیے اس قدر عمدہ اور مؤثر دعا کی کہ ہماری ہچکیوں کے آگے بند باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ بھائی کی جدائی سے زیادہ یہ چیز رُلا رہی تھی کہ ایسے صبر والی ماں کہاں مل سکتی ہے!

یہ صبر، یہ رتبہ انہیں ایسے ہی نہیں مل گیا تھا۔ کچھ تو فطرت نیک تھی کچھ صالح والدین کی اولاد تھیں لیکن حق سچ بات یہ ہے کہ اس کے لئے بڑی مشقتیں، ریاضتیں کیں۔ بن آہِ سحر گاہی کچھ نہیں ملتا میں نے بچپن کا جب بھی تصور کیا ہے تو میری آنکھ کھلنے کا سبب ان کی مناجات ہوتی تھیں۔ اس قدر دلسوزی سے دعا مانگتیں کہ میں دس پندرہ منٹ کروٹیں بدل بدل کر تنگ آکر اٹھ جاتی۔ان کی مناجات کا اپنا ہی انداز تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں بڑی عاجزی کے ساتھ بتایا کہ میں فخر یہ نہیں تحدیثِ نعمت کے طور پر بتا رہی ہوں کہ میں نے ساری زندگی قرآن کو چاند کے طلوع کے ساتھ مشروط رکھا ہے۔ پہلی تاریخ کو قرآن شروع کرتی ہوں اور اگلے چاند پہ دوسرا شروع ہوجاتا ہے سوائے رمضان کے(اس میں بس امی قرآن میں ہی گم رہتیں)اس کے علاوہ سورۃ البقرہ، ملک، یاسین، رحمان اور مزمل بھی روزانہ پڑھتی ہوں۔اپنی اٹھہتر سالہ زندگی کے پچاس سال انہوں نے بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا۔ دوردراز سے بچیاں قرآن پڑھنے آتیں۔ باعمل تھیں تو زبان میں اللہ نے تاثیر اتنی دے رکھی تھی کہ جہانیاں جیسے قصبے میں انہوں نے عورتوں کو قرآن سے شعوری طور پر منسلک کرنے کے لئے ہفتہ وار درس

قرآن کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ بھی پانچ دہائیوں سے زائد جاری رکھا۔ مشکل سے مشکل موضوع پر اتنی عمدگی سے مثالیں دے کر بات کرتیں کہ پڑھے لکھے بھی منہ دیکھتے رہ جاتے۔ میمونہ خالہ بتاتی ہیں کہ 1971ء کے الیکشن میں جماعتی امیدوار کے لئے پروگرامز میں سوشلزم جیسے موضوع پر یوں بات کرتیں کہ سننے والوں میں اسلام کی حقانیت کا احساس جوش مارنے لگتا۔ اپنے درس قرآن میں روز مرہ مثالیں دینے کے ساتھ ساتھ انداز بیاں سادہ رکھتیں۔ کتاب سے شوق گھٹی میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم محمد عبداللہ کی کتاب دوستی پورے برصغیر میں مشہور تھی۔ ان کے والد انتہا درجے کے عاشق رسولؐ تھے۔ یکم دسمبر 1974ء کی رات کو انہوں نے نعت کہی۔

؎ میرا اس طرح سے حساب ہو

میرے لب پہ نعت جنابؐ ہو

اگلے دن دو دسمبر کی سہ پہر اپنی نعت سناتے سناتے دائیں جانب دیکھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ یوں میری والدہ کو کتاب دوستی ہی نہیں عشق رسولؐ بھی ورثے میں ملا۔ صبح تلاوت کے بعد رو رو کر دعا مانگتیں۔ ان کی دعا کا اپنا ہی اسلوب تھا۔ اسمائے حسنیٰ یوں پڑھتیں کہ ہر اسم الٰہی کے ساتھ دعا کرتیں۔ بچپن سے ہی میں نے **یا فتاح افتح لنا ابواب رحمتک، یا ستار استر عور اننا انک ستار العیوب** تک پہنچ کر ہچکیوں سے روتے پایا۔ آپ خود سوچیں جو عورت ننانوے ناموں کو دعاؤں میں شامل کر کے مانگنے کا ہنر جانتی ہوگی، دعا مانگنے کا قرینہ آتا ہوگا، اس کی دعا کس قدر محبوب و مقبول ہوگی۔ دعا مانگتے ہوئے وہ بالعموم امت مسلمہ سے شروع کرتیں۔ میں اکثر حیران ہو جاتی کہ ایسے تو کوئی بیمار بچے کے لئے بھی بلک بلک کے دعا نہیں مانگتا جیسے یہ پاکستان اور امت مسلمہ کے لئے مانگتی ہیں۔ کوئی حج عمرے پر جاتا یا با جی سعودیہ واپس جاتیں، اپنی ذات کے لئے کچھ نہ مانگا بس یہی کہتیں، پاکستان کے حالات بہت نازک ہیں خاص دعا کرنا۔

عصر کے بعد کا وقت حدیث مبارکہ میں ہے کہ تسبیحات کا وقت ہوتا ہے۔ وہ عصر کے بعد بہت غمزدہ ہو جاتیں۔ شروع عمر سے اخیر عمر تک یہ وقت گزارنا ان کے لئے بہت مشکل ہوتا روتے روتے اکثر

؎ دل غم کو کھا رہا ہے

غم دل کو کھا رہا ہے

پڑھا کرتیں۔

ان کے غموں کی فہرست بہت عجیب تھی۔امت کی بیٹیوں کی بے حیائی کا غم، حکمرانوں کی عیش کوشی کا غم، عوام الناس کا دین سے دوری کا اور بدعتوں میں مبتلا ہو جانے کا غم۔آخر میں جامعہ حفصہ کے غم نے تو انہیں لاچار کر دیا تھا۔

ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ایک دفعہ میری قرآنی کلاس میں اتنی طویل دعائے حاجت کروائی کہ سبھی شرکاء نے پوچھا آپ نے یہ دعا کہاں سے یاد کی؟ جواب دیا رمضان میں عمرہ کی توفیق ملی تو ختم قرآن کے موقع پر امام صاحب نے یہ دعا کروائی تھی میں نے پیچھے دہرا دہرا کر یاد کر لی۔اون سلائیوں کی اتنی ماہر تھیں کہ بقول ان کے دور سے بھی اگر کوئی شخص ڈیزائن والا سوئٹر پہن کر گزر جائے تو ایک نظر ڈال کر وہ ڈیزائن بنا دیا کرتی تھیں۔ہاتھ میں اتنی لذت تھی کہ چنے کی دال کی کھچڑی بھی بناتیں تو انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ یادداشت کا یہ عالم کہ چار ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنی ماں کے منہ سے اشعار سن سن کر یاد کیے ہوئے تھے۔

اچھا حافظہ اور شوق جمع ہو جائے تو کیا عالم ہوتا ہوگا کہ پہلے حج پر گئیں تو واپسی پر عربی کے ساتھ ترکی بول سکتی تھیں۔ کہنے لگیں ہمارے ساتھ والے کمرے میں ترک عورت تھی۔ میں اپنی کوئی بھی چیز اس کے کمرے میں لے جا کر پوچھتی تو وہ ترکی میں اس کا نام بتاتی جو میں فوراً یاد کر لیتی تھی۔عمر کے آخری دنوں میں حافظے کا یہ عالم تھا کہ کوئی واقعہ پوچھ لیں وہ دن تاریخ اور سن کے ساتھ بتاتی تھیں۔ پوری جزئیات اور منظر نگاری کے ساتھ ایسا رنگ بھرتیں کہ سنتے ہوئے وہ جگہ اور واقعہ چشم دید محسوس ہوتا۔ مجھے یاد ہے میرا میکہ گھر میں کوئی اہم واقعہ ہو، سنٹر پوائنٹ بن جاتا ،زلزلہ ہو،سیلاب، جنگ ہو یا کوئی غیر معمولی واقعہ خدمت خلق میں سب سے آگے ہوتیں۔ ہر جگہ سے سامان ہمارے ہاں جمع ہوتا اور امی ابو دونوں بنڈل بناتے۔امانت کے بارے میں اتنے حساس تھے کہ 1978ء یا1979ء میں جب بدترین سیلاب آیا تو جن رسیوں سے سامان بندھا ہمارے گھر میں پہنچتا وہ رسیاں بھی بنڈلوں میں ڈال کر بھجوا دی جاتیں۔انفاق فی سبیل اللہ میں اتنا آگے تھیں کہ ہم جن کو ’’ملنے والیاں‘‘ سمجھ کر چائے پانی کا اہتمام کر رہے ہوتے وہ دایاں ہاتھ تھوڑا سا نیچے کر کے ان کی مٹھی میں رقم تھما رہی ہوتی تھیں۔کتنی دی، یہ ہمیں کبھی پتہ نہ چلا۔ ہاں جب تک ابو زندہ تھے دونوں اردو

انگریزی کی بجائے اربعین، خمسین، مائۃ سے کام چلاتے۔عربی وہ بھی گنتی کون سیکھے۔اس لیے کبھی پتہ نہ چلا۔عربی سے دلی محبت تھی۔سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں سورہ یوسف یاد کرلی تھی۔

کہتے ہیں کہ بندے پر جب کوئی پریشانی آتی ہے وہ کیسے جانے کہ یہ پریشانی اس کے گناہوں کی سزا ہے یا آزمائش۔اس کا آسان سا طریقہ سلف صالحین نے یہ بتایا ہے کہ اگر اس پریشانی کے بعد دل بے سکون رہنے لگے اور تعلق باللہ (نماز، ذکر اذکار صدقہ خیرات) کم ہوجائے تو وہ سزا ہوتی ہے۔آزمائش کی صورت میں نفل ذکراذکار صدقہ خیرات بڑھ جاتا ہے اور دل مطمئن رہتا ہے۔اس فارمولے کو آگے رکھا جائے تو ہم نے انہیں ان کی زندگی میں سدابہار آزمائشوں میں ہی پایا۔بیٹی ملتان گئی ہے۔نفلوں کی مان لی، اس نے دو بجے پہنچنا ہے چار نفل مان لیے۔دو بج کے پانچ منٹ ہوگئے تو دو گنے، پانچ منٹ اوپر ہوگئے تو پھر تین گنے نفل ہوگئے۔نفلی روزوں کی منت بھی اسی طرح مانتیں جیسے نفل رکعت کی۔حمزہ (پوتے) کا تقریری مقابلہ ہے نواسا سفر میں ہے گھر نہیں پہنچا۔نواسی کا رزلٹ آنے والا ہے، بھتیجا بھتیجی پیپر دینے جارہے ہیں انکے نفل بڑھتے اور دعا لمبی ہوتی چلی جارہی ہے۔اکثریوں دیکھا فون کی بیل ہورہی ہے۔بڑی امی پیپر شروع ہیں دعا کریں۔تائی اماں فلاں کام ہے دعا کریں، احسن آرہے ہیں ''پھپھو پیپر'' سانس پھولا ہے''دعا کریں'' اور پھوپھو دعاؤں پہ جت گئیں۔سب سے مزے کی صورت حال اس وقت ہوئی جب میں اپنے پانچوں بچوں کو ان کے پاس بھجوا کر دوسال قبل حج پر گئی تھی۔بچوں کی ہمیشہ سب اچھا ہے کی رپورٹ دیتی رہیں لیکن جب منیٰ جانے لگے تو ان کا فون آیا۔قانتہ بیٹے تم نے رمی نہیں کرنی بہت رش ہوتا ہے۔ان کی آواز میں ممتا کی التجا تھی کہ کچلی نہ جاؤ۔میں نے کھٹ سے جواب دیا :اچھا۔ان کو شبہ سا ہوا یہ ''اچھا'' ڈنگ ٹپاؤ والا اچھا ہے فوراً میرے میاں کو فون کیا۔اشتیاق بیٹا کمزور جان ہے قانتہ کی اس کی طرف سے تم کنکریاں مار لینا۔اب ان کو کیا خبران کی بیٹی شیطان مردود کی خاطر تواضع کے لئے کس قدر پرجوش ہے، میں نے اشتیاق کے ہاتھ سے سیل فون لے کر کہا ''اچھا جی داماد کی جان کی کوئی فکر نہیں۔'' فوراً صفائی پیش کی نہیں نہیں۔مجھے تو دونوں کی جان بڑی پیاری ہے۔ساتھ ہی آواز بھرا گئی۔قانتہ بیٹے میں نے منت مانی ہوئی ہے تم لوگ خیریت سے

پہنچو میں سو نفل ادا کروں گی۔ دو روزے رکھوں گی اور ایک ہزار روپیہ فی سبیل اللہ دوں گی۔ جب ہم فیصل آباد ائیر پورٹ پر پہنچے بھی نہیں تھے جہاز میں سگنل آن ہوتے پہلی کال امی کی تھی۔

''پہنچ گئی ہو بیٹے۔''

''ابھی پانچ سات منٹ ہیں امی۔'' میں نے جواب دیا۔ بہت پریشانی سے کہنے لگیں۔ قانتہ بیٹے یہ تین گھنٹے جب تم دونوں میاں بیوی ہوا میں معلق تھے مجھ پر اتنے مشکل گزرے کہ ہر دو چار منٹ کے بعد تعداد بڑھاتی چلی گئی۔ میں نے سو سے دو سو نفل، دو سے چار روزے اور ایک سے دو ہزار رقم بڑھا دی۔

ہائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا

حال نیں

میں کس کو بتاؤں میری ماں شب زندہ دار تھیں، صائم الدھر تھی، تہجد گزار تھیں، باعمل تھیں، صابرہ اور شاکرہ تھیں، شکر کے معاملے میں ان کا یہ معاملہ تھا کہ اکثر کہتیں میں دن کا آغاز شکرانے کے ان دو نوافل سے کرتی ہوں جو میں اپنے مسلمان ہونے پر روزانہ پڑھتی ہوں۔ پھر زبیر (بڑے بیٹے) کے لئے دو نفل پھر کلثوم کے لئے۔ اس طرح آخری چھوٹی بیٹی شافعہ کے لئے دو نفل پڑھ کر کام مکمل نہیں کر لیتی تھیں بلکہ پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں تک کے لئے روزانہ نفل پڑھ کر دعا کرتیں۔

جب وہ نا قابل بیان حد تک اذیت میں تھیں۔ ہم نے ان کے منہ سے ''ہائے'' کا لفظ نہیں سنا۔ اللہ سے رحم کی التجا، آسانی اور مدد کی دعا ہی مانگتی رہیں۔ ایک دفعہ تھوڑا سا تکلیف کا اظہار کیا ساتھ ہی اللہ سے معافی مانگی میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ بیٹا ہر وقت میرے پاس رہتا ہے۔ ایک بیٹی ایک طرف سے منہ میں نوالہ ڈال رہی ہے دوسری بیٹی دوسری طرف سے بہو، پوتے پوتیاں میرے پاس موجود رہتے ہیں۔

اگر کبھی رسالے میں میری تحریر شامل نہ ہوتی تو بس یہی کہتیں ''اس دفعہ تم نے کچھ نہیں لکھا رسالہ تمہاری تحریر کے بغیر سونا سونا سا لگتا ہے۔ بیٹی کی تحریروں کی لمبی چوڑی تعریف شاید اس لیے نہیں کرتی تھیں کہ اس کا نفس نہ پھول جائے، ہاں ایک بات کا وہ اکثر شرما کر ذکر کرتیں کہ تمہاری تحریر اپنی جگہ پر لیکن تمہارے دروس مجھے زیادہ پسند ہیں۔ جہانیاں کا سالانہ چکر لگتا تو آنے بہانے میرے درس کا اہتمام کر لیتیں۔ پھر مجھے بہت خوشی سے بتاتیں کہ تم نے فلاں بات کا ذکر کیا تھا اپنے

درس میں، اس وقت سے میں نے اس پر عمل شروع کر دیا ہے۔

میں نے اپنی تمام زندگی میں ان کو بس وضو اور نماز کا اہتمام کرتے پایا۔ جب ان کے دونوں پھیپھڑے جواب دے چکے تھے تب بھی انتہائی مشقت کے ساتھ وضو کرتیں اور جھک کر انگلیوں (پاؤں کی) میں خلال کرتیں۔ میں نے ان کو نماز کا وقت شروع ہونے سے قبل ہی جائے نماز پر پایا۔ وہ اس حدیث کا مصداق تھیں۔ ''جن کے دل مسجدوں میں کیلوں کی طرح گڑ ے ہوتے ہیں وہ سفر پر چلے جائیں یا بیمار ہو جائیں تو اللہ ان کے لئے فرشتوں سے دعا کراتا ہے۔'' نماز نہ پڑھنے والا سگا نواسا ہی کیوں نہ ہو انہیں تڑپاتا تھا۔ میرے بیٹے کو اکثر کہتیں اگر تم نے امتحان میں اے گریڈ لیا تو تازہ تازہ سرخ نوٹ اگر نماز باقاعدگی سے اول وقت ادا کی تو ہرا نوٹ ملے گا۔ تمام اولادوں آل اولادوں کی نمازوں کے بارے میں فکر مند رہتیں۔ فون پر استفسار کرتیں۔ نماز کے متعلق کئی نظمیں زبانی ازبر تھیں۔ بہت عرصہ پہلے ایک حدیث نظر سے گزری تھی کہ جو اول وقت پر نماز ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے کہہ رکھا ہے کہ ان کی جان نکالنے میں تنگی نہ کرنا۔ اس چیز کی میں گواہ ہوں کہ ڈیڑھ ماہ کی تکلیفوں کے بعد ان کی موت کا وقت اسی پلنگ پر بیٹھی بیٹی کو بھی پتہ نہ چلا۔ یاسین پڑھتے ہوئے میں امی کو دیکھتی جا رہی ہوں بس سانس کی آواز نہ آنے پر شبہ سا ہوا۔ ہچکی آئی نہ گردن ڈھلکی۔ سلام قول من رب الرحیم پڑھ کر پھونک مارتے مارتے میں نے دیکھا امی نے سانس لیا ہے۔ سورۃ یاسین کے ختم ہونے پر کچھ بھی نہ رہا۔ اللہ اکبر! بس لمحے بھر میں جھریاں ختم۔ مسکراتا چہرہ اور اذیت کا نام و نشان نہیں۔

چیز ٹھکانے پر رکھنے میں ان جیسا کسی کو نہ دیکھا۔ جب بیماری کی شدت سے نڈھال تھیں تب بھی نیل کٹر پرس کے فلاں خانے میں ہے، کاغذات فلاں بیگ میں، چابیاں فلاں جگہ پر، فلاں تفسیر کی فلاں جلد اس کمرے میں، خود کہتی تھیں لائٹ گئی ہوئی ہو گھپ اندھیرے میں رات کے بارہ بجے میں اپنی چیز بغیر دقت کے اٹھا سکتی ہوں۔

امی کو پورے خاندان میں ''فیملی نیٹ ورک'' کا اعزاز ملا ہوا تھا۔ پوری فیملی سے مضبوط رابطے میں تھیں۔ جب تک ٹانگوں نے ساتھ دیا ہر کسی کی غمی و خوشی میں شامل ہوتی تھیں۔ ان کا اپنا فارمولا تھا کہ خوشی میں

انسان بلاوے پر جاتا ہے غمی میں بن بلائے جانا چاہیے۔ اس لیے بسا اوقات تین تین چار چار میل پیدل چل کر غمی میں شامل ہوتیں، درس دیتیں، صبر کا مفہوم اور اجر واضح کرتیں۔ جب ٹانگوں نے چلنے سے جواب دے دیا تو خاندان کے ہر فرد سے بذریعہ فون رابطہ تھا۔ ہر اولاد کے لئے ٹائم مخصوص تھا۔ مجھے بالعموم صبح کے پونے دس سے دس بجے تک فون کرتیں۔ پہلا سوال ہوتا کیا کر رہی ہو؟ میں جواب دیتی کہ ناشتہ بنا کے بچوں کو سکول، کالج بھیجا ہے۔ دوپہر کا کھانا تیار کیا ہے اب کپڑے دھونے کے بعد لکھت پڑھت میں ہوں۔ اس پر پہلے ماشاءاللہ کہتیں۔ پھر دعاؤں کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔ آخر میں کہتیں بیٹے میں بھی ایسے فجر کے وقت ہی کام نبٹانے کی عادی تھی۔ ساری زندگی کاموں کو سر پر حاوی نہیں رکھا، بس صبح سویرے کر کے فارغ ہو جاتی تھی۔ اگر میری آواز میں تھکاوٹ محسوس ہوتی تو فوراً کہتیں نظر بد لگی ہے۔ میں خوب ٹکا سا جواب دیتی۔ لو جی اور سنو! مجھے کیوں نظر لگنا ہے کسی کی؟ اس پر لمبی چوڑی بحث کی بجائے بس مختصر سا فقرہ کہتیں۔ بیٹے دنیا میں خوش ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اکثر بتاتیں کہ آیات شفا پڑھ کے تم لوگوں کا ذہن میں تصور لا کے پھونک مار دیتی ہوں۔ میری دوست نے ان کی وفات کے بعد نہیں، تین سال پہلے خواب میں جنت میں سونے کا محل دیکھا، استفسار پر پتہ چلتا ہے کہ یہ قانتہ کی امی کا ہے ان کے صبر کی بنا پر دیا گیا ہے۔ میں نے خواب ان کو سنایا۔ فون پر چہرے کے تاثرات تو نہیں پتہ چلے آواز میں حسرت ہی حسرت تھی۔ جنت کی طلب میں کوشاں رہتیں اکثر ایسے عمل کر جاتیں کہ ہم حیران رہ جاتے۔ جہنم سے اتنا ڈرتیں کہ رو رو کر آنسو ختم کر لیے۔ بات بعد میں کرتیں پہلے رونے لگ جاتیں۔ قانتہ قبر میں میرا کیا ہوگا۔ بہت مدت کے بعد اس سوچ نے ان کو قرار دیا کہ اچھے برے سب نے جانا تو قبر ہی میں ہے۔ جائے بغیر تو گزارا ہی نہیں۔''

میری دادی کا انتقال ہوا تو ابو بہت دکھی رہتے۔ ایک دن مجھے اپنی ڈائری دکھائی جس میں پنجابی کا شعر لکھا ہوا تھا۔

؎ چار دناں دا اڈی ٹاپا دو دن کھانا پینا
ماں موئی تے مُک گئے میکے کیہہ
کڑیاں دا جینا

دیکھا تو پاس کھڑی امی رو رہی ہیں۔

مجھ سے خواب دیکھنے والی دوست نے پوچھا قانتہ تمہاری امی کس قسم کا صبر کرتی ہیں۔ میں نے کہا صبر کی ایک قسم ایسی ہے جس کا عورت تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرے والد صاحب نے چالیس سال کی عمر میں آ کر چلتا کاروبار چھوڑ دیا کہ چالیس سال تک دنیا کمالی ہے اب گھر میں رہ کر اللہ اللہ کروں گا۔ امی نے پانچ بیٹیوں کے رشتے ڈھونڈے، ان کے علاوہ بیٹوں کی شادیاں کیں ہر غمی خوشی میں سب سے آگے ہوتی تھیں۔ مردوں کی ساری ذمہ داری گھر میں عبادت کرتے ہوئے شوہر کو جتلائے بغیر اپنے سر پر لے لیں۔ کہنے لکھنے میں یہ آسان عملاً بے حد مشکل ہے۔ ابو کے انتقال کے بعد یتیم پوتے پوتی اور بہو کے لئے چھپر چھاؤں بن گئیں۔ واش روم کا مسئلہ ہے، پلمبر کو فون کر رہی ہیں، بلوں کے لئے رقم بھجوا رہی ہیں، گندم پسوانا ہے تو مزدور کو فون کر کے بلا رہی ہیں۔ کمال ذمہ داری کے ساتھ انہوں نے یہ فرائض زندگی بھر ادا کیے۔ اپنی زندگی کے دکھ کو ایک طرف کر کے بیوہ بہو کے لئے بلند مینار اور سہارا بن گئیں۔ یہ ان کی دعائیں ہی تھیں کہ ان کا پوتا میٹرک میں پوزیشن ہولڈرز میں شامل تھا۔

صبح آٹھ نو بجے سے سب رشتہ داروں کے حال احوال دریافت کرنے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ خاندان کی ہر خبر، ہر فرد تک پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی۔ اور یہ وصف اتنا زیادہ تھا کہ 2001ء میں ماموں احمد سعید نے زبردستی بلدیاتی الیکشن کے لئے نامزد کر دیا۔ اپنے بھائی کو تو انکار نہ کر سکیں البتہ شرط رکھی کہ میں اپنی کنویسنگ کے لئے گھر سے نہیں نکلوں گی۔ اپنے لیے ووٹ مانگا نہ مانگنے دیا لیکن جب رزلٹ آیا تو جج انگلیاں منہ میں دیئے بیٹھا تھا کہ یہ خاتون کون ہیں جن کے دھڑا دھڑ ووٹ نکلے جا رہے ہیں ان کو تو ناظم کی سیٹ پر کھڑے ہونا چاہیے تھا۔!

حرام سے تو ہر کوئی بھاگتا ہے وہ مشکوک اور مشتبہ سے بھی دور رہتیں۔ مشتاق ڈار کی کتاب ''شرک ہمارا سنگین مسئلہ'' چھپ کر آئی تو پڑھنے کے بعد فون پر زار و قطار روتی رہیں۔ کہنے لگیں میں تو بڑی غفلت میں رہی۔ میں ہمیشہ دعا مانگا کرتی تھی کہ یا اللہ مجھے اور میری آل اولاد کو حرام موت اور حرام رزق سے بچانا۔ یہ کتاب پڑھ کر پتہ چلا کہ شرک کے ایک ذرے کی بھی صورت شامل ہو جائے تو حلال رزق بخشواتا ہے نہ حلال موت! اب میں یہ مانگوں گی کہ اللہ شرک سے، حرام موت سے اور حرام رزق سے بچا۔

کسی اجنبی گھر سے آیا کھانا بغیر استفسار کے نہیں کھاتی تھیں کہ حرام نہ ہو...... بڑے سے بڑا چوٹی کا عمل کر کے بھی اپنے آپ کو بے عمل سمجھتی تھیں۔ میں اکثر چڑ کر کہتی ''یہ کیا ہوا جس کے لئے کیا ہے وہ قبول بھی نہ کرے گا؟''

آرام سے جواب دیتیں ''کیا پتہ اس تک یہ عمل کس حال میں پہنچا ہوگا۔''

دور پرے کے رشتہ داروں کو بھی خوشیوں میں مبارکباد کے اور غمی میں تعزیت کے فون کے ذریعے یاد رکھتیں۔ اس وقت ان کو بہت کوفت ہوتی جب ان کو اپنے کسی عمل کی وضاحت پیش کرنا پڑ جاتی، خفا ہو کر یہ شعر پڑھتیں۔

ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم
کر دیا
ہم دعا لکھتے رہے اور وہ دغا پڑھتے
رہے

خاصا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ میں اکثر چھیڑتی اندر سے خود ادیبہ ہیں اور مجھے قلم تھما دیا۔ بس مسکراتی تھیں اور کچھ نہیں۔ آخری دنوں میں بہت رقیق القلب ہوگئی تھیں، ردیف قافیے کے ذریعے گفتگو کرتیں۔ مجھے دائیں طرف اور شافعہ کو بائیں طرف بٹھا کر پہلے تو دعا دی پھر کہنے لگیں۔ اک میری چھوٹی، اک میرا موتی۔ دو دفعہ یہ کہا تو میری چھوٹی بہن شافعہ نے کھٹاک سے کہا ''امی! چھوٹے ہونے میں کیا کمال ہے؟ وہ تو اللہ نے ہی بنا دیا؟ کمال تو موتی بننے میں ہے۔ مسکرا کے جواب دیا کہ موتی ہونا بھی اللہ کی طرف سے ہی ہے وہ انسان خود بن جاتا ہے؟

عبادات کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے جبکہ عادات کا براہ راست اسکی مخلوق سے۔ عادات کے ضمن میں پہلی گواہی شوہر دے سکتا ہے، ہم نے ابا جی کو ہمیشہ گھر کے کونے میں مصروف عبادت دیکھا۔ جب مرد گھر میں ہی چوبیس گھنٹے رہنے لگے تو سب کچھ الٹ پلٹ جاتا ہے۔ ہم نے ایسا کوئی ماجرا نہ دیکھا بلکہ قریبی عزیزہ کے میاں ریٹائرڈ ہو کر چار دن گھر میں رہے، ان کی مداخلت بے جا سے گھبرا کر وہ بطور خاص امی کو ملنے آئیں اور کہنے لگیں ''آپا آپ کا بڑا حوصلہ ہے۔ میری تو چار دن میں بس ہوگئی ہے۔''

یہی نہیں گھر میں مصروف عبادت میاں کی خدمت گزاری کی حد ہماری امی پر ختم تھی۔ ابا جی کو ساری زندگی سوائے اللہ کے کسی سے مانگنے کی عادت نہیں

تھی۔ ان کے پیش نظر ہمہ وقت یہ حدیث رہتی ''ناحق مانگنے والے کا گوشت روز قیامت ان کے رخساروں سے نوچ لیا جائے گا۔'' اس لیے ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ اباجی نے پاس پڑا گلاس تک کسی بیٹی کو اٹھانے کا کہا ہو امبادا یہ بھی مانگنے یا سوال کرنے کی صف میں آ جائے۔ امی نے ایک ایک چیز اباجی کو بن مانگے فراہم کی۔ ہم نے اباجی کو کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ ''ابھی کھانا نہیں بنا۔'' وقت پر کھانا ٹرے میں رکھ کر دیتیں۔ سلاد چٹنی، پانی ہر چیز ساتھ ہی موجود ہوتی۔ ایک دفعہ پتہ نہیں کیا ہوا، امی ٹرے میں پانی کا گلاس رکھنا بھول گئیں۔ اباجی نے آواز لگائی ''کربلا والو۔'' امی سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بھاگ کر کچن میں گئیں اور پانی کا گلاس لا کر دیا۔ بعد میں بہت مدت تک اس بات کا مزہ لیتی رہیں۔ کہنے کا مطلب یہی ہے کہ جو عورت پانی کا گلاس تک مانگنے کی نوبت نہ آنے دے اس کی خدمت گزاری اور وفاداری کی کوئی حد ہو سکتی ہے؟

شوہر کے بعد دوسری گواہی پڑوسیوں کی ہوتی ہے۔ پڑوس میں بائیں جانب امی کی سگی ممانی رہتی تھیں جن کو وہ ''مامی'' کم اور سہیلی زیادہ سمجھتی تھیں۔ اکثر دونوں راز و نیاز میں مصروف رہتیں۔ دائیں جانب جو خاندان آباد تھا۔ ان سے سات پشتوں تک ہمارا خونی رشتہ نہ تھا۔ خاتون خانہ کے شوہر کراچی میں مقیم تھے۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ان پر اچھے برے ہر طرح کے حالات آئے۔ امی نے ایسے اچھے انداز میں حق ہمسائیگی ادا کیا کہ جب ان کی اولادیں اپنے گھروں میں آباد ہو گئیں، بیٹے شہر یا ملک سے باہر قیام پذیر ہو گئے تو یہ ان خاتون کا میری امی کے لئے محبتوں کا اعتراف تھا کہ اپنے بیٹوں کے پاس جا کر رہنے کے بجائے انہوں نے تنہا اسی گھر میں رہنا پسند کیا جہاں امی جیسے پڑوسی ایک نعمت کے طور پر موجود تھے۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اسی پڑوس کو فضلیت دی۔ باقی گلی محلے میں جتنے گھر آباد تھے سب کی وہ ''آپاجی'' تھیں۔ ہر ایک سے ان کے الگ نوعیت کے تعلقات تھے جب دیکھو محلے کی کوئی نہ کوئی خاتون اپنی داستان امیر حمزہ لے کر بیٹھی ہوتی۔ امی نے کبھی ان کے جانے کے بعد ہمارے سامنے تبصرہ نہ کیا۔ نائی ہوں یا قصائی، سنارے ہوں یا اللہ کے پیارے سب ان کے بے حد قریب تھے۔

بچپن میں چالیس بچے روزانہ قرآن پڑھنے آتے اور کبھی کوئی چیز گم ہو جاتی تو شور شرابے کی بجائے بچوں

کو نفسیاتی طریقے سے آزماتیں۔'' میں رات کو ایک وظیفہ کروں گی، صبح اس بچے کے ماتھے پر لکھا ہوگا اور سب کو نظر آئے گا بس اس بچے کو نظر نہیں آئے گا۔ یا پھر آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرے گا جس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہوگا۔ پھر وہ راز داری سے کہتیں اگر وہ چیز گھر لے گئے ہو تو کل آتے ہوئے چپکے سے ڈیوڑھی والی الماری میں رکھ دینا پتا ہی نہیں چلے گا۔ اور ہمیشہ بچے نے اٹھائی ہوئی چیز واپس رکھ دی۔

اگر ذکر عبادت کا ہی کرتے جائیں اور عادات کو چھوڑ دیں تو یہ انسانیت کی نفی ہے۔ امی کا اپنی سسرال سے بھی مثالی تعلق تھا۔ تینوں چچیاں دونوں پھوپھو کا ذکر بہت محبت سے کرتی تھیں۔ جس طرح اپنے بھتیجے بھانجے بھانجیاں پیاری تھیں اس سے بڑھ کر دیوروں نندوں کے بچوں میں جان تھی۔

میرے چچا کی بیٹی ایف ایس سی کر رہی تھی۔ لمبے بال اور ڈاکٹر بننے کا اس سے بھی لمبا جنون!! اس دن رات کی پڑھائی میں سر میں جوئیں پڑ گئیں۔ اینٹی لائس شیمپو کا زمانہ نہیں تھا۔ اتفاقاً امی فیصل آباد پہنچیں۔ چچا کی بیٹی نے چھوٹتے ہی اپنا مسئلہ ''بڑی امی'' کو پیش کیا۔ بڑی امی اس کے سر کی صفائی کے مشن پر جت گئیں۔ دو دن کے بعد واپسی کے وقت بہت فکر مند تھیں کہ مجھے پتا کیسے چلے تمہارا سر صاف ہو گیا ہے۔ موبائل فون ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا بڑی امی نے ''کوڈ'' بتایا کہ اگر سر صاف رہا تو خط میں الحمدللہ۔ صاف نہ ہوا تو انا اللہ لکھ بھیجنا۔ جہانیاں پہنچیں۔ جب تک فیصل آباد سے الحمدللہ والا خط نہ آ گیا۔ چین نہ آیا۔ فیصل آباد میں تو آنے بہانے چکر لگاتیں۔ جتنا انہیں اپنی دیورانی سے پیار تھا اس کے بچے کہیں زیادہ محبوب تھے۔

امی کی جس روز شادی ہوئی اس روز میری پھپھو اور ماموں کی بھی شادی تھی۔ الحمدللہ پھپھو جب تک زندہ رہیں۔ بہت محبت سے دونوں رہیں۔ ممانی کو اللہ صحت دے، ماشاءاللہ ان سے بھی احترام اور دوستی کا تعلق رہا۔

ہم لوگ سسرال کی ناگوار باتوں کا ذکر لاتے تو ''چلو چھوڑو پرے'' کہہ کر موضوع بدل دیتیں۔ زاہد خشک نہ تھیں۔ لطیفوں کا ایک اچھا خاصا سٹاک موجود تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی، میں اپنی بھتیجی کو موبائل سے لطیفہ پڑھ کر سنا رہی تھی تو آہستہ آہستہ نقاہت زدہ لہجے میں لطیفہ صحیح اور اصلی حالت میں سنایا۔

کبھی منہ پھاڑ کر قہقہہ نہیں لگاتی تھیں مسکرا کر یا بے آواز ہنس کر کام چلاتیں۔

اگر بشری تقاضوں سے ملازمین کو یا بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ لیتیں تو اکثر معافی مانگ کر ٹافیاں دے کر تلافی کر لیتیں۔ ماتھا چوم لیتیں۔ ضرورت کی کوئی چیز ہاتھ میں تھما دیتیں۔ عید بقرعید کی صبح ''میٹھا'' بھیجنے کا آغاز اپنی نندوں کے گھروں سے کرتیں۔

آخری دنوں میں جو ڈاکٹر معائنے کے لئے آتا، وہ بس ان کے صبر کی داد دیتا اور فرمائش کرتا کہ آپ ان سے دعا کے لئے کہیں جو اس حالت میں بھی اللہ کو پکار رہا ہے اس کی پکار سیدھی عرش تک پہنچے گی۔

ہم لوگ عام طور پر دین صرف نماز روزے تہجد اشراق کو سمجھتے ہیں جبکہ ان کی نظر اس سے ہٹ کر بھی تھی۔ اکثر کہتی تھیں کہ اپنے ابو کے ورثہ کو جلد تقسیم کر لو جب تک ورثہ تقسیم نہ ہو مرنے والا صاحب جائیداد، قبر میں بے سکون رہتا ہے۔ وفات سے ڈیڑھ سال قبل اپنا سارا زیور، سامان، کپڑے بہوؤں بیٹیوں میں تقسیم کر کے ہلکی ہو گئیں۔ گھر میں برتن، مشینری، بستر فرنیچر رہ گیا تو حسرت سے کہتیں اللہ میرا حساب نہ لینا یہ تو اس لیے رکھا ہے کہ میری اولاد چھٹیوں میں جمع ہوتی ہے۔ بھائی نے ان کی وفات کے تیسرے روز وہ بھی تقسیم کر کے ان کو ہلکا کر دیا۔

آج ان کی عرشوں تک پہنچے والی دعائیں ہیں نہ ان کی گریہ وزاری......ان کے وجود سے پھوٹتی برکتیں، رحمتیں جو سب کو محسوس ہوتی تھیں آج کہاں سے ڈھونڈیں؟؟ لوگ کہتے ہیں آپ نیک ماں کی اولاد ہیں آپ ہمارے لیے دعا کریں۔ میں کم مایہ ان سے کیا کہوں؟ مجھے تو اپنے لیے مانگنے کا سلیقہ نہ آیا میں کسی کے لئے کیا مانگ سکتی ہوں۔ سوائے اس دعا کے جو میری مرحومہ ماں اکثر مانگتی تھیں اللہ مجھے سارے پیاروں سے عرش کے سائے تلے ملانا آمین۔ اللھم اغفر لھا وارحمھا۔

ے جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

☆☆☆

آسیہ راشد

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری

اسلام کا سچا آفاقی پیغام دلوں میں اتارنے والے میاں بیوی کی کہانی جو شرک زدہ معاشرے میں اللہ کا گھر بنانے پر مصر تھے۔

بیگم زاھدہ ضیاء الرحمٰن صاحبہ کا شمار ان خوش قسمت لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے دین کی سربلندی کیلئے منتخب کر لیتا ہے۔ زاہدہ اور ان کے شوہر ضیاء الرحمٰن صاحب نے امریکہ Voorhees نیو جرسی میں اقامت صلوٰۃ کیلئے ایک مسجد کی تعمیر کروائی۔ اس مسجد کی تعمیر میں انہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس نے ان کے لئے دین کی تبلیغ کے راستے کھول دیے اور انہیں بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یقیناً ہر شہر میں خیر چھپا ہوتا ہے۔ ضیاء الرحمٰن صاحب مسجد کی تعمیر کے ایک سال بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے آمین۔

راقمہ فیصل ٹاؤن میں واقع زاہدہ ضیا صاحبہ کی ہمشیرہ بیگم ریحانہ رفیق صاحبہ کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کیلئے پہنچی تو سادہ سی شلوار قمیض میں عجز وانکسار سے بھرپور خاتون نے خوشدلی سے استقبال کیا۔ میں نے ان سے کہا میں آپ سے ملاقات کی بے حد متمنی تھی۔ میں اس ہستی سے ملنا چاہتی تھی جن کو بہت سے لوگوں کو مسلمان کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ میری یہ بات سنتے ہی ان کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے اسی نے توفیق دی ورنہ ہم کس قابل تھے۔

میں نے پوچھا کہ آپ امریکہ کی کون سی اسٹیٹ میں رہتے ہیں؟ آپ نے مسجد کی تعمیر کا کام کب اور کیسے شروع کیا؟ امریکہ کب گئے؟ تو انہوں نے گلوگیر لہجے میں اپنی کہانی سنانی شروع کی۔

میرے میاں بنیادی طور پر انجینئر تھے۔ 1972ء میں ہماری شادی ہوئی۔ ان دنوں وہ ایم ای ایس اسٹیٹ گیریزن میں کام کرتے تھے۔ بعدازاں چکوال ائیربیس میں کچھ عرصہ رہے۔ انہی دنوں انہیں کامن ویلتھ والوں کی طرف سے سکالرشپ ملا جو بعدازاں ڈراپ ہوگیا۔ مگر انہوں نے ہر صورت میں باہر جانے کا

ارادہ کرلیا۔شاید اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی تبلیغ کا کام لینا تھا۔ اپنی جاب سے استعفیٰ دیا اور 7 اپریل 1973ء میں امریکہ چلے گئے۔

ان دنوں ضیاء صاحب کے بڑے بھائی وہاں رہتے تھے۔انہیں ایک کیمیکل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ پہلے ہم پنسلوینیا میں رہے پھر نیوجرسی شفٹ ہوگئے۔ یہ دونوں اسٹیٹس قریب قریب ہیں۔

جس علاقے میں ہماری رہائش تھی وہاں دور دور تک کوئی مسجد نہ تھی۔ہم چاہتے تھے کہ وہاں مسجد ہو جہاں جا کر ہم نماز ادا کرسکیں۔ضیاء پانچ وقت کے نمازی تھے۔ نمازی والدین کی اولاد تھے۔مسجد میں نماز نہ پڑھنے کی تکلیف انہیں سونے نہیں دیتی تھی۔ ہروقت بے چین رہتے کہ نماز کہاں پڑھیں۔روح وقلب کو شادمانی اور قرار میسر نہ تھا۔ہم اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کا وہ گھر بنانا چاہتے تھے جو اس کا بنیادی حق اور مقصد ہے کہ وہ ایسا مرکز بنے جہاں اردگرد کے لوگ آئیں باہم ملاقات کریں ،ایک دوسرے سے اپنے دکھ درد بانٹیں،علم سیکھیں اور سکھائیں۔ مغربی طرز زندگی گزارنے والوں کیلئے مسجد جیسا کمیونٹی سنٹر بہت ضروری تھا۔اسی بے چینی اور بے قراری نے ان سے مسجد کی تعمیر کا کام کروالیا۔

یہ مسجد 1980ء کی دہائی کی بات ہے جب ہم نے مسجد بنانے کیلئے سوچنا شروع کیا اور ساتھ ہی ہم جگہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔قریبی علاقے سینیگاگ میں ہم نے بہت جگہ ڈھونڈی مگر نہ ملی۔ آخر پیلمار Palmarah میں ہمیں کسی نے بتایا کہ ایک کمیونٹی سنٹر ہے جو آج کل بند پڑا ہوا ہے پہلے پہل وہاں چرچ ہوا کرتا تھا۔ ہماری کمیونٹی نے اسے خرید لیا اور اسے اسلامک سنٹر بنادیا۔

یہ بہت خستہ حال عمارت تھی۔ہم نے اس کی دوبارہ مرمت کروائی اور اس میں بہت سی تبدیلیاں کروائیں۔ اس کی تجدید کے بعد اس کا نام اسلامک سینٹر آف ساؤتھ جرسی رکھا گیا۔اس کا قبلہ بالکل سیدھا تھا۔اللہ کی توفیق سے یہ ہماری پہلی کامیابی تھی۔جس روز یہاں سب سے پہلی نماز جمعہ ادا کی گئی اس میں صرف پانچ لوگ تھے۔رفتہ رفتہ نمازیوں کی آبادی بڑھنے لگی۔اب یہاں بہت لوگ نماز ادا کرتے ہیں۔شروع کے سالوں میں ماہ رمضان مبارک میں ہم ڈاکٹر غلام مرتضیٰ مرحوم کے بیٹے زاہد مرتضیٰ صاحب کو تراویح پڑھانے کیلئے بلاتے۔انہیں خصوصی طور پر ویزہ بھیج کر پاکستان سے

بلوایا جاتا۔

اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لہٰذا ضیا صاحب کو خیال آیا کہ کیوں نہ ہم ایسی جگہ پر مسجد بنائیں جہاں مسلمان کمیونٹی زیادہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہو سکیں اس بات پر ان کے سبھی مسلمان دوستوں نے ان کے ساتھ اتفاق کیا۔

ایک جگہ دیکھی گئی مگر اس کی قیمت بہت زیادہ تھی ہمارا بجٹ کم تھا۔ ہم سوچتے رہے کہ یہ سب کیسے ہوگا؟ مسجد کیسے بنے گی؟ فی الوقت ارادہ ملتوی کر دیا۔ بس اللہ سے دعائیں کرتے رہے۔

آخر ہماری دعاؤں کی قبولیت کا وقت آ ہی گیا۔ یہ سب کام اللہ کی رحمت اور توفیق سے ہی ہوتے ہیں۔ انہی دنوں ہم نے Voorhees نیوجرسی میں ایک اور جگہ دیکھی۔ یہ دو گھر اکٹھے تھے، ہم ایک لینا چاہتے تھے مگر مالک مکان دونوں اکٹھے بیچنے پر مُصر تھا۔ دونوں کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ پھر وہی مسئلہ پیسوں کا تھا۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے پھر ہماری مدد کی جب انسان اللہ کے راستے پر کام کرنے نکل پڑتا ہے تو بلاشبہ غیبی مدد شامل ہو جاتی ہے۔ پاکستان سے بہت سے لوگوں نے رقوم بھیجیں، وہاں کی کمیونٹی نے مدد کی، ہم سے جس حد تک ہو سکا ہم نے اپنا حصہ ڈالا اور پیسوں کا بندوبست ہو گیا مگر ابھی مسجد نہیں بن سکتی تھی۔

امریکہ کے قانون کے مطابق کوئی بھی عمارت بنانے کے لئے ٹاؤن ہال سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ ٹاؤن ہال والے وہاں کے رہائشی لوگوں کو اطلاع دے کر اجازت لیتے ہیں کہ آپ کو اس عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں کوئی شکایت تو نہیں پھر سب کی اجازت سے منظوری دی جاتی ہے۔

جب ہماری غیر مسلم کمیونٹی کو معلوم ہوا کہ ہم یہاں مسجد بنانا چاہتے ہیں تو وہ ہمارے مخالف ہو گئے۔ شروع شروع میں دو تین سو لوگوں نے مخالفت کی پھر رفتہ رفتہ تمام کمیونٹی ہمارے خلاف ہو گئی۔ انہوں نے بھرپور احتجاج کیا کہ اگر یہاں مسجد بنی تو ہم ہر صورت میں اسکی تعمیر رکوائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہاں پر مسجد بنی تو یہاں پر گولیاں چلیں گی، دہشت گردی ہوگی، لہٰذا انہوں نے مسجد کی مخالفت میں مقدمہ درج کروا دیا۔ یہ 2003ء کا واقعہ ہے۔ دو سال پیشتر وہاں گیارہ ستمبر کا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ لوگ خوفزدہ تھے، وہ مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے تھے۔ انہیں مطمئن کرنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے اپنے

مقدمے کیلئے بہترین وکیل ''بل ہائی لینڈ'' کو منتخب کیا۔ مسجد کی تعمیر کے تمام مراحل میں ہمارا آرکیٹکٹ انجینئر اور دیگر سبھی غیر مسلم تھے اسی لئے ہمارے لیے غیر مسلم ریاست میں کام کرنا آسان ہوگیا۔

پوری دنیا کا قانون ہے کہ نان پرافٹ آرگنائزیشن سے کوئی پیسے نہیں لیے جاتے یہ ہمارے لئے بہت فائدہ مند تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہمارے مقدمے کا کیا فیصلہ ہوگا؟ وہ لوگ چاہتے تھے مسجد آبادی سے دور بنائیں۔ وہاں کے میئر نے اپنی تقریر میں ہمارے اس نیک کام کرنے کے جذبے کی بہت تعریف کی کہ یہ بہت اچھا کام کرنے جارہے ہیں۔

یہ مقدمہ بہت شہرت پا چکا تھا اور تمام اخبارات اس مقدمے کی خبر کو اپنے اخبارات میں جگہ دے رہے تھے۔ مقدمے کی پہلی پیشی میں ڈیڑھ سو لوگوں نے مخالفت کی۔ ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ آئندہ کیا ہونے والا تھا۔ بظاہر تمام کمیونٹی ہمارے خلاف تھی ہم دعائیں کر رہے تھے۔ شاید کوئی کرامت ہوجائے۔ اللہ کا گھر بننا تھا تو راستے بھی اسی نے ہموار کرنے تھے جب کسی کام کیلئے اللہ کا حکم ہوجاتا ہے تو اسباب بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔

انہی دنوں ایک بدھسٹ خاتون لوری ووپی (Lory Vopi) جو اخبار میں چھپنے والے اس مقدمے کے بارے میں باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی، جس روز مقدمے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ وہ بھی عدالت میں آگئی۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تمام لوگوں نے مسجد بنانے کی بھرپور مخالفت کی۔ کوئی ایک فرد بھی ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ بھلا اتنی مخالفت کے بعد مسجد کیسے بن سکتی تھی۔ ہم سبھی مایوس تھے آخری آدمی کٹہرے میں آکر مسجد کے خلاف بیان دے رہا تھا۔ اتنے میں عدالت میں ڈرامائی کیفیت طاری ہوگئی جب لوری ووپی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ اسے اجازت مل گئی۔

اس نے بتایا کہ وہ بدھ مت کی پیروکار ہے اور بہت دنوں سے اخبار میں مسجد کی تعمیر کے مقدمے کو پڑھ رہی ہے، آخر انصاف کی خاطر یہاں چل کر آئی ہے۔ اس نے کہا آپ کو قانون کو نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ قانون کی پاسداری سب پر لازم ہے۔ ہمارے ملک کا قانون سب کو مذہبی آزادی دیتا ہے۔ ہمارے ملک کا ہر فرد آزاد ہے، ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عبادت کیلئے اپنے مذہب کے مطابق مسجد، گرجا یا مندر بنائے،

اس لیے آپ کو اس مقدمے کو انصاف سے سننا چاہیے۔ عدالت میں مکمل سناٹا تھا، ہر شخص اپنی جگہ پر حیران تھا۔ سب سے زیادہ حیران ضیا صاحب تھے جو چند لمحے پہلے بالکل مایوس بیٹھے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی تعمیر کیلئے ایک غیر مسلم خاتون کو عدالت میں بھیجا تھا جو بہت مدلل انداز میں اپنا موقف بیان کر رہی تھی۔

رات ایک بجے عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا اللہ اکبر مسجد بنانے کی اجازت مل چکی تھی۔ میں گھر بیٹھی مسلسل دعائیں کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا اگر اللہ نے اس جگہ پر اپنا گھر تعمیر کروانا ہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

ہماری دعائیں قبول ہوئیں اور یوں مسجد بنانے کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرے مرحلے میں مسجد کا سائٹ پلان تھا۔

اس مقدمے کی پہلی پیشی اپریل 2003ء میں ہوئی۔ کل چار پیشیاں ہوئیں 22 ستمبر 2006ء کو مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ اب مسجد کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ اسے مکمل ہونے میں دو سال لگے۔ اس کی تعمیر پر پچاس لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔

اب مخالفت میں قدرے کمی آ گئی تھی مگر اس مخالفت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کیلئے ہمارے راستے کھولے۔ انہی دنوں سینیگال کے چرچ والوں نے ہمیں بلایا کہ آپ لوگ چرچ میں آ کر اسلام کے بارے میں ہمیں بتائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ضیا صاحب سے خاص کام لینا تھا اس لیے انہیں زبان پر مکمل عبور، علم کی فراوانی اور خداداد صلاحیتیں دی تھیں اگرچہ نہ وہ کوئی سکالر تھے نہ ہی عالم دین، بس ایک عام سے مسلمان تھے جو مسجد میں نماز پڑھنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے Islam Expained کے نام سے ایک پریزنٹیشن تیار کی جس کے ذریعے اسلام کا تعارف اور اسلامی طرز زندگی کی تعمیر و تشکیل کو بہت موثر انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام کا مطلب اللہ کو سپردگی ہے، اسلام کردار سازی پر زور دیتا ہے۔ ایک مسلمان اچھا دوست، اچھا شوہر، اچھا ہمسایہ، ذمہ دار شہری ہوتا ہے۔ اس کا بہترین کردار ہی اس کی شناخت ہے۔

چرچ میں موجود لوگ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ کیا اسلام متشدد کارروائیوں کا دوسرا نام ہے؟ قرآن کا پیغام کیا ہے؟ ضیا صاحب نے تمام سوالات کے مدلل جواب دیئے اور کہا کہ اسلام تو پیار و محبت اور اخوت کا درس دیتا ہے۔ وہ ہمیں سکھاتا

ہے کہ کیسے ہم نے دوسروں کے مذاہب کا احترام کرنا ہے، ان کی عزت کرنی ہے، ایک دوسرے کے احساسات کا پاس رکھنا ہے۔کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ جو اللہ لوگوں کو پیدا کرے وہی ان کو مارنے کا بھی حکم دے؟ کیا خدا کی منشا یہ ہوسکتی ہے کہ لوگوں کا قتل عام کیا جائے؟ جو اللہ لوگوں کے امن وسکون کیلئے قوانین وضع کرے، وہی قوانین توڑنے کا بھی حکم دے؟ وہ اپنے لیکچرز سے حضرت محمدؐ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو خاص موضوع بناتے تا کہ غیر مسلم ان کی بات توجہ سے سنیں۔

اس پروگرام کے بعد ہمیں بہت سے چرچ کے پروگراموں اور مختلف سکولوں میں جا کر اسلام کو متعارف کروانے کا موقع ملا۔ پھر بہت سے یہودی، عیسائی اور بدھ مت کے ماننے والے ہمارے پروگراموں میں شریک ہونے لگے۔اسلام کی برکات اور تعلیمات سے دل پگھل رہے تھے۔ وہ اسلام کی عظمت کے قائل ہوتے جارہے تھے۔ضیا صاحب اپنے ہر لیکچر میں ان سے درخواست کرتے کہ وہ اسلام کے بارے میں ضرور سوچیں۔ رفتہ رفتہ ان کے خدشات دور ہوتے چلے گئے۔ بہت سے لوگوں کو اللہ کی توفیق سے دینِ اسلام کی برکات سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔یہ ہمارے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔

جب مسجد مکمل ہوگئی تو ہم نے مسجد کی تعارفی تقریب کا اہتمام کیا جس میں عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی بلایا گیا تھا۔اس تقریب کا سپیکر نومسلم تھا جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا۔ جب سب لوگ آئے تو ہم نے انہیں مسجد دکھائی۔مسجد کی محراب ترکی سے ڈیزائن کروائی گئی تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ مسجد کے بیرونی ڈھانچے اور روح میں مسجد نبویؐ کی جھلک نظر آئے۔

مسجد میں ایک بہت بڑا ہال نماز کیلئے مختص ہے۔ایک کانفرنس روم ہے جہاں علمی مباحث ہوتے ہیں اور لیکچرز کا اہتمام ہوتا ہے۔بچوں کے لئے علیحدہ کمرہ ہے جہاں ناظرہ قرآن پڑھایا اور نماز سکھائی جاتی ہے۔ان کی بہترین کردار سازی کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہم انہیں سکھا رہے ہیں کہ محبت کے لائق وہی ہوتا ہے جس سے ملنے کے بعد انسان اپنے آپ کو پرسکون محسوس کرے،جس سے کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ نہ ہو جس سے کوئی تلخ بات سننے کو نہ ملے جس سے دوسرے کے جذبات مجروح نہ ہوں۔آپ نے ایسا انسان بننا ہے۔

مسجد اپنے مقدمے کی وجہ سے بہت شہرت حاصل

کر چکی تھی۔ دور دراز سے لوگ اسے دیکھنے آتے۔ انہی دنوں ایک مصری مسلمان [illegible] آیا۔ میں اور ضیا دونوں مسجد میں کھڑے تھے۔ ہم نے خوش دلی سے انہیں خوش آمدید کہا۔ بیٹی نے بتایا: ''میرے میاں مسلمان ہیں۔ ہماری شادی کو پچیس سال ہو گئے ہیں۔ میں پہلے نن تھی میں نے بعد میں ان سے شادی کر لی۔''

ضیا نے اس سے پوچھا ''کیا آپ نے ان پچیس سالوں میں کبھی مسلمان ہونے کے بارے میں نہیں سوچا؟''

وہ بولی ''نہیں کبھی نہیں۔''

ضیا صاحب نے انہیں کہا ''ہم پھر کبھی آپ سے ملیں گے اور اس بارے میں بات کریں گے۔ آپ اس کے بارے میں ضرور سوچیں۔''

کچھ روز بعد وہ دوبارہ آئی۔ ہم لوگ اسے لے کر کانفرنس روم میں آ گئے۔ وہاں ہمارے ساتھ اسکا تفصیلی مکالمہ ہوا۔ ضیا صاحب نے پوچھا ''آخر اسلام قبول کرنے میں آپ کو کیا چیز مانع ہے؟'' وہ بولی ''پہلی بات یہ ہے کہ میں اپنا سر نہیں ڈھانپ سکتی کیوں کہ مجھے اس کی عادت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔''

ہم نے اسے کہا کیا صرف یہ دو چیزیں آپ کے اسلام لانے کے راستے میں رکاوٹ ہیں؟ آپ اسلام لے آئیں یہ باتیں آہستہ آہستہ آپ قبول کرتی جائیں گی۔ بہت سی عورتیں سر نہیں ڈھانپتیں مگر وہ مسلمان ہیں۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ وہ بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ اسلام کسی پر جبر نہیں کرتا۔ آپ اسلام لانے کے بارے میں سوچیں۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں ضرور سوچے گی اور پھر وہ اکثر آتی رہی اور ہم سے ملتی رہی یوں چند ہی ملاقاتوں کے بعد اس نے اپنی شناخت ڈھونڈ لی اور اسلام قبول کر لیا۔

اسلام لانے کے بعد بیٹی میری بہت اچھی ساتھی بن گئی ہے۔ وہ دین کے ہر کام میں میری بہت مدد کرتی ہے میں اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لے کر جاتی ہوں۔ وہ مسجد کے اندر اپنا سر ڈھانپ کر رکھتی ہے۔ اسلام نے اس کے دل پر اتنا اثر کیا ہے کہ اذان کے الفاظ کی خوبصورتی اس کے دل کے تاروں کو چھو لیتی ہے جس سے اس کے آنسو رواں دواں ہو جاتے ہیں، اس کے وجود پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کہتی ہے ''میرے دل میں مسلمانوں کا بہت برا تصور تھا مگر اسلام تو بہت ہی

خوبصورت اور سچا مذہب ہے جو تمام مذاہب اور بنی آدم کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ یہ وہ دین ہے جو کسی بھی سچائی کے متلاشی کی روح کی دل جوئی کر سکتا ہے۔“

میرے رب کا بڑا احسان ہے کہ تمام مسلم اور غیر مسلم ہمیں خوشدلی سے آگے بڑھ کر ویلکم کرتے ہیں ہمارا احترام کرتے ہیں۔ ہمیں دلوں میں عزت دیتے ہیں۔ زندگی بہت مختصر ہے اس میں جلدی جلدی آگے بڑھنا چاہیے۔ وقت پر کام کریں گے تو منزل ملے گی۔ ابھی ہمارے پاس مہلت ہے ہم کام کر سکتے ہیں۔ ابھی اپنی اصلاح کرلیں جو بھی اچھا کام کرنا چاہتے ہیں اس میں جلدی کرنی چاہیے۔

اسی سوچ اور فکر نے ضیا صاحب سے بہت سے کام کروا لیے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے کوئی بڑا کام لے لیتا ہے تو اسے واپس بلانے کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ انہی دنوں ضیا صاحب کی نظر دھندلانے لگی۔ ڈاکٹر کو دکھایا [illegible] ریفر کر دیا۔ اس نے ”دماغی سرطان“ تشخیص کیا۔ اسی روز سینیگال میں ان کی پریزنٹیشن تھی۔ ہم دونوں ہر جگہ اکٹھے جاتے تھے۔ اتنی تکلیف دہ خبر سننے کے بعد بھی انہوں نے تقریب میں جانا ملتوی نہیں کیا اور وہاں جا کر بہت ہمت اور حوصلے سے تقریر کی۔ چند روز بعد ان کی سرجری ہوئی، تین دن کے بعد ہم گھر واپس آ گئے۔

اب کیموتھراپی کا مشکل مرحلہ تھا۔ جس پہلے روز کیمو کیلئے جانا تھا اسی روز شام کو ایک سکول میں تقریب تھی۔ کئی ماہ پہلے تقریب کے انتظامات کر لیے گئے تھے، اس لیے دن کا بدلنا مشکل تھا۔ کیموتھراپی جیسے اذیت ناک مرحلے سے گزرنے کے باوجود ضیا صاحب انتہائی نقاہت کی حالت میں تقریب میں شامل ہوئے اور کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ سب اللہ کی رحمت سے ممکن ہوا ورنہ ہم سب کس قابل ہیں۔ وہ مستقل مزاج انسان تھے تبھی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے۔

مسجد کی تعمیر کے ایک سال بعد ضیا صاحب چند ماہ علیل رہ کر اس دنیا سے چل بسے۔ [illegible] وہ چلے گئے مگر ان کا کام زندہ ہے۔ یہ مسجد ان کیلئے صدقہ جاریہ ہے جس کا اجر انہیں تا قیامت ملتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

؎ کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

(دنیا میں کوئی ایسا کام کر جاؤ کہ دنیا تمہیں عزیز رکھے)

☆☆☆

حجامہ: ایک مسنون اور مؤثر طریقۂ علاج

حجامہ / پچھنے لگوانا(Cupping Therapy) ایک مسنون طریقہ علاج ہے ۔صحیح بخاری میں سعید بن جبیرؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ترجمہ) ''شفا کے تین ذریعے ہیں' شہد کا استعمال ، پچھنا اور داغ لگانا (cauterize) اور داغ دینے سے میں اپنی امت کو روکتا ہوں''۔امام ابن قیم طب نبوی میں اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں آپ ﷺ نے''علاج بالحجامہ کا ذکر فرما کر فصد کے ذریعہ علاج کی راہ ہموار کردی ہے''(صفحہ ٦٧)۔

حجامہ یا پچھنا لگوانا سے کیا مراد ہے؟ ڈاکٹر تیمور شعبان جو کہ انٹرنیشنل کپنگ تھیراپی سوسائٹی کے وائس چیرمین ہیں اپنے مضمون hat is cupping Wtherapy? میں لکھتے ہیں کہ یہ local congestion یا فاسد خون کو cup(s) کے ذریعے vacuum لگا کر نکالنے کا طریقہ ہے جس میں heat یا suction کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم طریقہ علاج ہے۔ جو کہ یونانی، مصری اور چینی تہذیبوں میں رائج تھا ۔چین میں تو یہ آج بھی مقبول ہے۔اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی Alternative Medicine کے طور پر پڑھایا جاتا ہے.

سنتِ نبوی ﷺ میں حجامہ کی اہمیت:

احادیث میں پچھنا لگوانا یا حجامہ کروانے کی بہت تاکید ملتی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''بہترین علاج جو تم کرتے ہو وہ حجامہ کروانا اورعود ہندی کا استعمال ہے(بخاری)۔ ایک اورجگہ ارشاد ہے''جب تم میں سے کسی کا خون بھڑکنے لگے(ہائی بلڈ پریشر ہو) تو وہ حجامہ کروائے کیونکہ خون کے جوش مارنے سے آدمی کی موت ہوسکتی ہے'' (سلسلہ الصحیحہ :٢٧٤٧)۔ آپ ﷺ نے حالتِ احرام میں اپنے سر کا حجامہ کروایا کیونکہ آپ کو دردِ شقیقہ (آدھے سر کا درد) ہو گیا تھا (بخاری)۔ معراج کے موقع پر فرشتوں نے آپ کو حجامہ کی تاکید کی۔آپ ﷺ نے فرمایا'' معراج کی

رات میں فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرا اس نے یہی کہا، اے محمد (ﷺ) اپنی امت کو حجامہ کروانے کا حکم دیجیے (سنن ابن ماجہ)۔ صحیحین میں ابن عباسؓ سے مروی ہے (ترجمہ) ''نبی ﷺ نے پچھنا لگوایا اور حجام کو اس کی اجرت دی''۔ اس کے علاوہ انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں ''رسول اللہ ﷺ کو پچھنا ابوطیبہ نے لگایا۔ آپ نے بطور اجرت دو صاع غلہ دیئے جانے کا حکم دیا اور اپنے غلاموں سے گفتگو فرمائی۔ انہوں نے ابوطیبہ کا حصہ کم کر دیا، آپ نے فرمایا جن چیزوں سے تم علاج کرتے ہو ان میں بہتر پچھنا لگا کر علاج کرنا ہے''۔ ان احادیث سے حجامہ کی اہمیت و افادیت ظاہر ہوتی ہے۔

حجامہ کے فوائد:

امام ابن قیم طبِ نبویؐ میں رقمطراز ہیں کہ حجامہ بدن کے سطحی حصے کو صاف اور ستھرا بناتا ہے اس سے جلد کے اطراف کا خون نکلتا ہے اور سطح بدن مواد ردیہ سے صاف ستھرا اور پاک ہو جاتا ہے''۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''حجامہ اور فصد دونوں کے فوائد وقت، مقام، عمر اور مزاج کی روشنی میں مختلف ہوتے ہیں'' (صفحہ ۷۱)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجامہ کے ذریعے جسم سے زہریلے مادوں کا اخراج (Detox) ہوتا ہے اور اللہ کے اذن سے انسان بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی تکلیف / بیماری ہو تو وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ حجامہ کے بے شمار فوائد ملتے ہیں مثلاً یہ سر درد، مرگی، جوڑوں کے درد، ہر قسم کے زخم، ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، عرق النساء، موٹاپا، ہاتھوں کا سن ہو جانا، کندھوں کا درد اور سانس کی بیماریوں کا بہترین ذریعہ علاج ہے (www.Hijamanation.com)۔

پچھنا لگوانے کے ایام اور وقت:

ترمذی میں ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہر مہینے کی بہترین تاریخ پچھنا لگوانے کے لئے سترہ یا انیس یا اکیس تاریخ ہے''۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جو پچھنے کے لئے سترہ یا انیس یا اکیس تاریخ چاند کی اختیار کرے گا اسے ہر بیماری سے نجات و شفا ہو جائے گی''۔ لہٰذا حجامہ کے لئے چاند کی انہی تاریخوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے ''نہار منہ حجامہ کروانا مفید ہے اس میں شفا اور برکت ہے۔ یہ ذہانت بڑھاتا اور قوتِ حافظہ تیز کرتا ہے''۔ اس کے علاوہ آپ نے فرمایا کہ

جمعرات کو حجامہ کروایا کرو اور بدھ، جمعہ، ہفتہ اور اتوار کے روز حجامہ کروانے سے پرہیز کرو۔ پیر اور منگل بھی (بہتر ہیں) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی دن پیغمبر ایوبؑ کو بیماری سے شفا عطا کی اور بدھ کو انہیں آزمائش میں مبتلا کیا تھا اور برص اور جذام کے امراض بدھ کے دن یا رات کو ظاہر ہوتے ہیں۔ (ابنِ ماجہ)۔

پچھنا لگوانے کے مسنون مقامات:

سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے گردن کے دونوں اطراف کی رگوں پر اور کندھوں کے درمیان تین مرتبہ حجامہ کروایا۔ آپ نے احرام کی حالت میں اپنے پاؤں کی پشت پر اور اس کے علاوہ درد ہونے کی صورت میں اپنی سرین (Hip) پر حجامہ کروایا (سنن ابی داؤد)۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے مکہ کے راستے میں مقامِ لحی جمل میں اپنے سر کے بیچ میں حجامہ کروایا۔

حجامہ کس سے کروایا جائے؟

آپ ﷺ نے فرمایا "جو یونہی طبیب بن کر علاج کرے اور وہ طب وعلاج معالجے میں مشہور نہ ہو تو وہ (متوقع خرابی کا) ذمہ دار ہے" (ابی داؤد)۔ اس کے علاوہ ضروری ہے کہ حجام صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا پابند ہو اور اپنے مریض کی بیماریوں مثلاً خون کی بیماریاں، ذیابیطس، کینسر اور دل کے امراض سے آگاہ ہو۔

کن لوگوں کو حجامہ نہیں کروانا چاہیے؟

الھدیٰ پبلی کیشنز کے پمفلٹ "حجامہ" کے مطابق، بہت کمزور، دبلے پتلے، بہت بوڑھے یا بہت چھوٹے بچوں، حاملہ عورت اپنے ابتدائی تین ماہ میں، جگر کے شدید مرض اور خون نہ رکنے کی بیماری میں مبتلا افراد، اور وہ مریض جو خون پتلا کرنے والی ادویات پر ہوں یا Dialysis پر ہوں وہ حجامہ سے اجتناب برتیں۔

آخر میں یہ کہ ہمیں اپنی زندگی کو حفظانِ صحت کے بہترین اصولوں پر گزارنے، مختلف امراض سے بچنے اور ان کے علاج کے لیئے سنت کے طریقوں کے بارے میں جاننے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف ہم بہترین صحت کے مالک بنیں اور دوسری طرف سنت پر عمل کر کے اجر بھی کمائیں۔

☆☆☆

تمباکونوشی سراسرتباہی ہے

نظامِ تنفس کیلیئے خاموش زہر قاتل کی حیثیت رکھتی تمباکو نوشی کا مضرِ صحت ہونا روزروشن کی طرح عیاں ہے۔ پوری دنیا کے ڈاکٹر اور محققین کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ سگریٹ نوشی پھیپھڑوں میں موجود Mucus cells (رطوبت بنانے والے خلیات) کو Hyperactive کرتی ہے جس کی وجہ سگریٹ میں موجود نقصان دہ کیمیکلز ''نکوٹین اورٹار'' (Nicotine & Tar) کی موجودگی ہے جو Mucus cells کیلیئے Stimulants ہیں۔ نتیجتاً یہ خلیات ان کیمیکلز کے برے اثرات کو بہانے (Flush out) کرنے کیلیئے زیادہ رطوبت یا بلغم بناتے ہیں جو پھیپھڑوں کے نچلے حصوں اور باریک alveoli میں جا کر جمع ہوتا ہے۔ وہاں دوسرے خلیات اس رطوبت کا پانی جذب کر لیتے ہیں اور یہ گاڑھا ہوکر جم جاتا ہے جس کا نکلنا کافی تکلیف دہ ہوتا ہے اور بہت مشکل۔ سگریٹ نوشی کثرت سے کرنے والے لوگوں کی مخصوص کھانسی کا سبب بھی یہ نچلے حصے میں جمع ہونے والا بلغم ہے۔

خلیات ان زہریلے اثرات کے خلاف اپنی استطاعت سے زیادہ کام کرنے اورزہریلے مادوں کے باعث Cancerous cells میں تبدیل ہوسکتے ہیں جو آگے جا کر لازماً پھیپھڑوں کے کینسر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے اس بات کو جانتے بوجھتے ہر دوسرا شخص سگریٹ نوشی میں مبتلا ہے۔ کیوں؟؟

دوسری طرف ریاست کے فرائض کی اگر بات کی جائے تو عوام کی صحت اور تعلیم وہ بنیادی چیزیں ہیں جن کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہاں بھی افسوس کا مقام ہے! کھلے عام اس نقصان دہ اور سراسر نقصان دہ چیز کی فروخت ہورہی ہے لیکن ریاست بس اس لیے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگئی کہ اس سگریٹ کے ڈبے پر جملہ لکھا ہے کہ ''تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے'' وزارت صحت حکومت پاکستان!

یہ تو صرف ہمارے معاشرے کی ایک مثال ہے،

ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ منکر (برائی) پھیلتا ہی جب ہے جب اس منکر سے کراہیت ختم ہو جائے یا اسے غلط تو سمجھا جائے لیکن اپنے مفاد اور مزے کے لئے کھلی آنکھوں سے اس نقصان کو قبول کر لیا جائے۔

پہلی صورت میں لوگ اس نقصان دہ برائی کو اس لیے اپناتے ہیں کہ انہیں مزہ اور فائدہ قریب نظر آ رہا ہے جبکہ نقصان ان کی نظر میں ابھی دور ہے اس لیے اسے اختیار کرنے میں انہیں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔

دوسری طرف ریاست اسی برائی کو اختیار اور طاقت رکھنے کے باوجود اس لیے ختم نہیں کرتی کیونکہ وہ اپنے افراد کی صحت سے زیادہ مالی فائدے کی حریص ہے اور اس دور کے نقصان کو جو اس کے افراد کے بیمار اور ناکارہ ہونے کی صورت میں سامنے آنے والا ہے، صرف جلد حاصل ہونے والے فائدے پر قربان کر رہی ہے۔

دیکھا جائے تو یہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل ایک مسلم معاشرے کی شان نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ تو ہے ہی وہ معاشرہ جس کی تعلیمات دنیا کی جلد حاصل ہونے والی لذتوں کے مقابلے میں آخرت کے دیر سے ملنے والے فائدوں اور انعامات حاصل کرنے کی اسپرٹ پیدا کرتی ہیں ۔اس اندازِ فکر کا مطلب تو یہ ہوا کہ لوگ اور ریاست اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظریہ حیات کی حقیقی اسپرٹ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

تقویٰ (خوفِ خدا) صبر و برداشت ،حکمت، دوراندیشی جیسی صفات بحیثیت قوم ہم میں سے مفقود ہوتی جا رہی ہیں، جو اس مثال کے تناظر میں بھی نقصان دہ ہے اور بلاشبہ اس دنیائے فانی کے انجام اور آخرت کے حساب و کتاب کیلئے بھی زہر قاتل ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

رب کی سرگوشی

انسان ایک دوسرے کو ایسے دکھ دیتے ہیں، ایسے ظلم اور زیادتیوں کے کانٹے سینے میں پیوست کرتے ہیں جن کا کوئی مداوا نہیں ہوتا

ہر مشکل کام کے لئے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اور مجاہدے کے لئے مصمم ارادہ، استقامت درکار ہوتی ہے۔ ہر نیک کام کے ارادے پہ قائم رہنا جہاد ہے۔ ہر نیک کام میں پیش آمدہ مشکلات کا مقابلہ کرنا نیک کام کے اجر میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ انسانی سرشت پہ جو کام شاق گزرتا ہے۔ اس کو مکمل کرنے کے لئے نفس پہ جبر کی بہت سی گھاٹیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔

انسان کا اپنے اوپر ظلم وزیادتی برداشت کرنا اور پھر اس کو معاف کرنا دنیا کا سب سے مشکل امر ہے۔ دوسرے کی زیادتی کو صاف کرنا قطعاً آسان نہیں ہے۔ جو کام مشکل ہے، اس کی جزا بھی زیادہ ہے۔ اس لیے کہ نفس کے ساتھ لڑنا پڑتا ہے۔

معاف کرنے کے معاملے میں کچھ معاملات وضاحت طلب ہوتے ہیں۔ اگر سب معاف ہی کرنے پر راضی ہو جائیں تو پھر عدالتیں کس لیے ہیں۔ حقوق کس طرح ملیں گے؟ ظالموں کو معاف کرنے سے ان کے ظلم میں اضافہ ہوگا۔ معاف کرنے والے اپنے حقوق کیسے حاصل کریں گے؟ ظالم کا ہاتھ کیسے رکے گا؟

حضور ﷺ کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہ لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حدود کو پامال ہوتا دیکھنا قطعاً گوارا نہ کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر صرف اپنی ذات پہ کسی نے زیادتی کی ہے۔ اور اس کے عمل سے اجتماعیت کو نقصان نہیں ہو رہا۔ کوئی اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود پامال نہیں ہو رہیں تو معاف کر دینا ہی افضل ہے۔ اگرچہ اس پر بھی مجبور نہیں کیا گیا۔

محسنین تو ''لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں''

(آل عمران 124)

''البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ عظیم کام صرف اولوالعزم لوگ ہی کر سکتے ہیں''(شوریٰ۔43)

''اور جو آدمی معاف کرے اور اصلاح کرلے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے''(شوریٰ 40)

اللہ تعالیٰ نے مظلوم کو معاف کرنے کا حکم ایسا نہیں

دیا جیسا کہ نماز، روزہ اور زکوۃ کا۔ کہ لازماً انہی فرائض کی طرح معاف کرنے کا فریضہ بھی انجام دو۔ بدلے کا، حق رکھا ہے، مگر اتنا ہی زیادتی کا حق دیا جتنا کہ بس معاملہ بالکل برابر رہے۔ معاف کر دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ حکم اس لیے نہیں دیا کہ یہ انسان کے لئے مشکل ہے۔ اور مشکل کام ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ عزمِ لامور ہے معاف کر دینے والے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اجرِ عظیم کی خوش خبریاں سنائی ہیں۔ قائل کیا ہے، مجبور نہیں کیا۔ ہم بھی دوسرے کو قائل کر سکتے ہیں معاف کرنے پر، مجبور نہیں کر سکتے۔ قائل کرنے والی اس عظیم ذات نے کیسے کیسے قائل نہیں کیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ

''قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ جن کا اجر اللہ کے ذمے ہے وہ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں تو صرف وہی کھڑا ہو گا جس نے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کیا ہو گا'' (منہاج القاصدین)

اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم مہربانی ہے کہ اس نے یہ مطالبہ بھی نہیں کیا کہ معاف کرنے والا معاف کرنے کے بعد اس ظلم و زیادتی کو بھول جائے۔ بلکہ جب بھی اپنے اوپر زیادتی یاد آئے اور پھر معاف کرے تو اجر میں اضافہ ہو گا۔ جتنی بار یاد آئے اور معاف کرے اجر کا پیمانہ بڑھتا جائے گا۔

نفسِ امارہ کی لگام کھینچنا اور بے لگام ہونے سے بچانا ایک مسلسل مشقت ہے۔

معاف کرنے کے لئے کیا جواز تلاش کیا جائے؟

اپنے اوپر ظلم کرنے والے کا کبھی نہ کبھی کیا ہوا احسان یاد کرے۔ اس کی کسی خوبی کا تصور کرے۔ معاف کرنے پہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے اجر کو محسوس کرے۔ یہ خیال کرے کہ اللہ کی نظر میں ہو سکتا ہے وہ مجھ سے بہتر ہو اس کا کوئی نیک عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو چکا ہو۔ معاف کرنے کے بعد بار بار ظلم و زیادتی یاد آئے تو گھبرائے نہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان اپنے اوپر زیادتی کو نہیں بھول پاتا۔ اعلیٰ اخلاق یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے انتقام کے طریقے نہ سوچے۔ انتقام کے طریقے سوچنے سے انسان کی ذہنی، قلبی، نفسیاتی تکالیف شروع ہوتی ہیں، وقت اور صلاحیتیں منفی طرزِ عمل میں برباد ہوتی ہیں، روح کی شکستگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ معاف کرنے سے روح ہشاش بشاش، ذہنی و قلبی آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ اور جب بھی زیادتی یاد آئے یہی عمل دہرایا

جائے۔حتیٰ کہ اپنی اندرونی کیفیت پہ قابو پانا آجائے۔ اور قیامت کے دن اپنے اعمالنامہ میں وزنی نیکیوں کا درج ہونا محسوس کر کے خوش ہوا جائے۔اس سے ذہنی، قلبی اور بسا اوقات جسمانی آزار کو سہارنا آسان ہوجاتا ہے۔بعض ظلم، تکالیف، ذہنی اذیتیں انسان کو ناقابل علاج بیماری کی طرح برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اورجس تکلیف کا علاج اپنے بس میں نہ ہو۔اس کو سہارنے کے لئے اللہ کی ذات کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان ایک دوسرے کو ایسے دکھ دیتے ہیں۔ ایسے ظلم اورزیادتیوں کے کانٹے سینوں میں پیوست کرتے ہیں جن کا کوئی مداوا دنیا میں نہیں ہوتا اور ان کانٹوں کی چبھن قبر تک ساتھ جاتی ہے۔ باہمی تنازعات کے یہ کانٹے سینوں سے خالق ومالک ہی نکال سکتا ہے۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ ونز عنامافی صدورھم من غل (اعراف) وہ مقام جنت ہی ہوسکتا ہے جہاں سب کے دل ایک ہوں۔

اس جنت میں جانے سے پہلے دنیا میں باہم انسانوں کو ایک دوسرے کے لئے آزمائش بنا دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو معاف کردیا کریں۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ رحم وکریم ہے اور اپنے ''کنبے'' (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کو باہم مشفق ومہربان دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ اس کا ذاتی رشتہ وتعلق ہے اس لیے اس مہربان ذات کوسب کا خیال ہے۔سب بندوں کو جنت اور اپنی رضامندی کی طرف لپکنے، دوڑنے ، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا یکساں موقع فراہم کیا ہے۔ایک ماں اپنے بچوں کے درمیان نزاع دیکھتی ہے۔ ہرکوئی اپنا حق جائز سمجھتا ہے۔ مظلوم معاف کرنے پرراضی نہیں اوراس کومجبور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہرکوئی اپنے حق کو جائز سمجھتا ہے۔کوئی دست بردار ہونے یامعاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا ہے تو ماں کہتی ہے۔''میری خاطر، معاف کردو۔'''' میری خاطر''اس جملہ میں ماں اپنی محبت کا واسطہ دیتی ہے۔ اوراس کا ساتھ دینے کا،اس کو زیادہ اپنا سمجھ لینے کا، اپنا سب سے اچھا بچہ تسلیم کرنے کا مان دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالی اپنے ان بندوں کو جن پہ زیادتی ہوئی یا جن کے درمیان نزاع ہے۔اپنا حق لینے اور بدلہ لینے کا حق دیتا ہے۔لیکن درجات کی بلندی کے لئے پیار اور مان سے کہتا ہے۔ جو میرے بندے ہیں جو زیادہ میرے قریب ہیں، ان سے توقع رکھتا ہوں کہ ''میری

خاطر اپنا حق چھوڑ دو، میری خاطر، معاف کردو' اس لیے کہ پھر محبت، مہربانی ،نجات، قرب، درجات کی بلندی کی ضمانت اس کے ذمہ ہو جاتی ہے۔ اپنے رب کی طرف سے یہ پیار بھری سرگوشی کا احساس دل میں زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ رب اپنے جس پیارے بندے کے دل میں رہتا ہے اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان چپکے چپکے گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور سرگوشی کا یہ انداز خالص تعلقِ محبت کا مظہر ہوتا ہے۔ اور مومن کی یہی تو معراج ہوتی ہے کہ اس کا رب اسے محبت کی نگاہ سے دیکھے، پیار کا احساس دلائے اور اللہ اس سے راضی ہو جائے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لئے مومن کو بھی اپنے نعس سے مسلسل جنگ کر کے اپنی محبت کا یقین دلانا پڑتا ہے۔ پھر ہی رضی اللہ ورضوعنہ، کا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

ہاں میں ہوں!

(نزہت ظفر)

پودے اُگانا میرا شوق بلکہ اس سے آگے ایک درجہ یعنی جنون ہے۔ میں نے اپنے باغیچے کو دوحصوں میں تقسیم کررکھا ہے ایک پھولوں کا اورایک سبزیوں کا۔سبزیوں کی کیاریوں سے گرمیوں سردیوں کی سب سبزیاں یاتقریباآدھی سے کچھ زیادہ میری ان کیاریوں سے اُگتی ہیں۔لہسن کا ایک پودا جب میں نے زمین سے اکھیڑا تو تیارلہسن میری طرف جھک کر شرمایا۔میں نے خوش ہوکراپنے ڈرائیوراسدکودکھایا۔

''دیکھواسد ہماری اپنی زمین سے اگا لہسن۔

''باجی! آزادکشمیرمیں اب زمینیں بنجر پڑی ہیں۔ ہمارے ہاں عورتیں بے کار ہوگئی ہیں۔سبزیاں وغیرہ اگاتی نہیں ہیں!''

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی''سبزیاں اگانا مردوں کا کام ہے۔عورتوں کانہیں۔میرے اندازے کے مطابق تومرد بے کار ہیں۔''میں نے اسے جواب دیا۔

''ہاں شاید مردہی بے کار ہیں جوعورتیں اتنی آزاد ہوگئی ہیں۔''وہ بولا۔

گویا جوچیزاس کے ذہن میں کوٹ کوٹ کربھردی گئی تھی اب اس کا نکالنا مشکل تھا یعنی قصوروارعورت ہی ہے،اس مفروضے کونکالنے کے لئے اتنا ہی وقت چاہیے جتنا کہ اس مفروضے کو پنپتے ہوئے وقت لگا ہے، یعنی صدیاں۔اوراس مفروضے کوخودعورت نے سینچا ہے یعنی مرد نے کہہ دیا''تم بےعقل ہو۔''عورت نے سرجھکا کر کہہ دیا''ہاں میں ہوں!''''تم محفل کی رونق بن جاؤ۔''اس حکم پراس نے سرخم کردیا۔اس کی فطری نرمی ہی اس کی دشمن بن گئی۔فاطمہ الزھرہؓ کے مطابق عورت کا سب سے بڑا جہاد اس کا گھر کو سنبھالنا اوربچوں کی پرورش کرنا ہےاوریہ جہادتو دن کے چوبیس گھنٹے سال کے بارہ مہینے حتیٰ کہ اس کی زندگی کی آخری گھڑیوں تک جاری رہتاہے۔وہ مرد جوعورت کو کہتا ہے،تم عورت ہوتم کچھ نہیں کرسکتی۔یہی عورت اس مرد

کو دنیا میں اللہ کی رضا سے لے کر آئی۔ راتوں کو اس کے ساتھ جاگی۔ خود بھوکے رہ کر اس کو کھانا کھلایا، اس کو پیر چلنا سکھایا۔ وہ کیسے بے کار ہے؟ اور جب وہ یہ بولتا ہے تو سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔

عورت مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ پسلی پہلو میں ہے۔ برابری میں ہے اس کو پیروں کی جوتی بنانے والے نبی پاکؐ کی اس حدیث کو بھول گئے۔ ''عورت مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر سختی سے موڑو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر چھوڑ دو گے تو ٹیڑھی رہے گی۔''

عورت کو اپنی پہچان کے لئے خود اپنی قدردانی کرنا ہوگی۔ گھر میں بیٹی کی پیدائش پر یہ سوچنا ہوگا کہ گھر میں رحمت آئی مصیبت نہیں، جنت کے دروازے کھلے ہیں، بڑھاپے میں بیٹی خدمت بھی کرے گی۔ بہو بن کر آئی ہے تو اس کو شفقت دینی ہوگی۔ پوتی آئی ہے تو خوشی سے گلے لگانا ہوگا۔ نواسی آئی ہے ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اسے دعائیں دینی ہوں گی۔ اگر یہ سب کر دیں تو پھر کوئی مرد یہ نہ کہہ سکے گا کہ تم میں خرابی ہے۔ اور جو گھر کی ملکہ کو ہر خرابی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اس کی خوبیوں کو بھی دیکھ سکے گا۔

☆☆☆

ادراک

(رافعہ صلاح الدین۔ کراچی)

''بھیا امی سے پوچھو پیسے ہیں؟''

اس آواز نے اس کے منتشر خیالات کی آماجگاہ یعنی ذہن کو حال میں لاکھڑا کیا...... اس آواز کے تعاقب میں پتا چلا کہ وہ جُھولے پر بیٹھی ہوئی بچی کا اپنے بھائی سے سوال تھا۔ اس نے اپنا دھیان بچی پر لگا دیا جو کہ اس علاقے کی نہ لگ رہی تھی۔ یہ ایک اپر مڈل کلاس علاقے کا پارک تھا۔ جہاں آنے والے تمام لوگ اپنے آپ کو کسی نہ کسی ''Brand'' سے منسلک کرنا سٹیٹس سمبل سمجھا کرتے تھے۔ جبھی وہ بچی اس کی توجہ کا سبب بنی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ بچی کوئی گندی سندی حالت میں یا خراب حلیے میں تھی وہ کاٹن کے فراک ٹراؤزر، پاؤں میں سینڈل، ہیر بینڈ یعنی اپنے طور پر بھرپور تیار تھی مگر پھر بھی وہ کراچی کے ہی کسی پسماندہ علاقے کی لگ رہی تھی جو شاید یہاں کسی کے گھر گھومنے آئی ہو۔

اچانک اس نے سر جھٹکا۔ وہ کیوں اس بے مصرف چیز پہ اپنا دماغ لگا رہی ہے۔ ہاں......اس کو یاد آیا کہ وہ بہت ڈپریشن کا شکار ہو کر یہاں آئی تھی۔ بلکہ

یہاں آکر بھی علاج تو نہ ہوتا اور ہی دوسروں کو دیکھ دیکھ کر بڑھ جاتا مگر پھر وہ جاتی بھی تو کہاں......؟ زندگی جتنی بے رونق اس کی گزر رہی ہے اتنی تو کسی کی بھی نہیں۔ ہر ایک یہاں خوش ہے مگر وہ......سکون کی تلاش میں اِدھر اُدھر دھیان بھٹکاتی پھرتی ہے......آخر خوش ہونے کو بھی تو کچھ ہو...... وہی صبح کی روٹین کے چند کام، پھر وہی فراغت۔ ٹی وی ٹیلیفون سے بھی کب تک دل بہلایا جائے۔ اور پھر یہی تو ہے جو اس کے ڈپریشن کا باعث بنا ہوا ہے......تمہارا چار ہزار کا سوٹ میرا آٹھ ہزار کا......تمہاری وہ Brand کم تر میری یہ Brand اچھی......تم لال قلعہ اب گئی ہم تو اب کولاچی کے دیوانے......

بھیا امی سے پوچھو نا دس روپے ہیں......؟

آواز نے دھیان کے کمرے میں دستک دی اور وہ اس کا دروازہ کھول کر پھر باہر آئی تو دیکھا بچی اپنے بھائی سے پھر پوچھ رہی تھی۔

نجانے کیوں اس کا دھیان پلٹ پلٹ کر بچی کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا تقریباً سارے بچے پارک کے ایک طرف چھوٹے سے کیبن سے چپس، جوسز اور دوسری چیزیں لے کر کھا رہے تھے بچی بھی یقیناً کچھ کھانا چاہ رہی ہوگی...... مگر بھائی کے جواب کہ ''نہیں امی کے پاس نہیں ہیں'' پر وہ دوبارہ کھیل میں لگ گئی اور وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ کیا دس روپے کی بھی یہ اہمیت ہے کہ وہ تو دس دس کے نوٹ ایک طرف ڈال دیتی تھی اور وقتاً فوقتاً ماسی کو انعام کے طور پر دے دیتی تھی یا وہ سکّے جو گاڑی کے Coin box کی زینت بنتے کہ فقیروں کا بھلا کر دیا جائے وہی دس روپے اس بچی یا اس بچی کی امی کے لئے اتنے قیمتی تھے......

اس نے بچی کی امی کی طرف دیکھا، وہ ہنستی مسکراتی اپنے بچوں کو کھیلتا دیکھ رہی تھیں۔ صاف ستھرا لان کا سوٹ، پرس سینڈل سب کچھ گرچہ عام سا تھا مگر ان کے چہرے پر اطمینان اس وقت اس کو بہت خاص لگا...... وہ خود جو سوٹ پہنے تھی، ڈیڑھ دن پرانا ملگجا ہی سہی مگر اس کا اسٹائل ہی بہرحال بچی کی والدہ سے قیمتی ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس کے واکنگ جو ایک مشہور Brand کے تھے۔ اور پھر اس کا والِٹ جس میں رکھے وہ روپے جن کو کم از کم اتنا سوچ کر خرچ نہیں کرنا پڑتا جتنا اس بچی کی امی کو کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر اس سب سے بڑھ کر ایک چیز تھی جو اس کے پاس فی الوقت نہیں تھی...... وہ بے فکری اور سکون جو اس عورت کے پاس

تھی......کیوں؟

اس کیوں نے اس کو نظر پھیرنے پر مجبور کیا تو دھیان میں وہی مناظر ابھر آئے جو لاشعوری طور پر اس کے ذہن پر قبضہ جمائے رکھتے تھے......کالونی کی فلاں مسز اور فلاں آنٹی جو خود کو کسی بھی طرح دوسرے سے بڑھا چڑھا کر پیش کرتی تھیں یا شاید اسکو بھی ایسا لگتا تھا......مگر آج اچانک جو سوچوں کی آندھی آئی تو سارے منظر صاف اور نکھر گئے۔ ہاں......! اس کے ڈپریشن اور بچی کی امی کے اطمینان و پرسکون رہنے کی وجہ صرف اور صرف ایک تھی اور وہ تھا شکر گزاری کا رویہ! جس سے وہ مال دار ہو کر بھی محروم و فقیر اور ان ماں بیٹی کو غنی بنا رکھا تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور سوچا کہ بچی کو دس روپے کے چپس دلا دے مگر نہیں......

بچی نہ ملنے پر بھی خوش، کھیل میں مگن تھی۔ بچی تھی نا بہل گئی تھی۔ یہ تو وہی تھی جو اکڑی ہوئی تھی! مگر آج اس بچی نے اسکو وہ مثبت سوچ اور سکون کا ماخذ بتا دیا جو وہ ہزاروں خرچ کر کے بھی حاصل نہ کر سکتی تھی۔ یقیناً اسی لیے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھنے سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

وہ اپنے پلو میں شکر کے موتی سنبھالے پارک کے خارجی دروازے کی طرف چل دی اور مسکرا کر اس بچی کی طرف دیکھا جو جانے انجانے میں اس کی زندگی کو آسان و فرحت بخش بنانے کا نسخہ تھما گئی تھی۔

اک استاد موت نے کھوہ لیا اے

(تہمینہ حنیف۔ گوجرہ)

اَج یاد کسے دی آئی آ　　بڑی سخت اداسی چھائی آ
کی جی نُوں ہندا جاندا اے　　کُجھ جگر نوں وڈھ وڈھ کھاندا اے
اج کُجھ نئیں چنگا لگدا اے　　بے چینی داہڑ وَگدا اے
دل غم دی چُھری نے کوہ لیا اے　　اک استاد موت نے کھوہ لیا اے
پیا زخم ہجر دا رِس دا اے　　آج استاد کتے نئیں دِسدا اے
ہر جلسے تے جا پہنچدے سی　　ہر وعدے تے آ پہنچدے سی
کوئی خوف نہ پیدل چلّن دا　　اوہ عادی سختیاں جھلّن دا
کوئی فکر نہ مینہ ہنیری دا　　کوئی خوف دوپہر نہ سحری دا
پرواہ نہ دُھپ تے پالے دی　　کیا بات سی کرماں والے دی
رب خوبیاں بہت عطائیاں سن　　ہر پاسے دھماں پائیاں سن
بہنو مالک سی　　اوہ اللہ نبی دا خادم سی
اوہدی خدمت رب منظور کرے　　اوہدی قبر نوں نور و نور کرے

آمین ثم آمین

☆☆☆

انسان کا Manual قرآن ہے

(فاطمہ عامر۔ نیوی ہائٹس کراچی)

ربِ کائنات نے ہم کو پیدا کیا اور وہی ہماری ذہنی اور جسمانی ضروریات اور احساسات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہی سب سے زیادہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک انسان کس طرح احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اس نے تو ہم کو یہ بھی بتادیا ہے کہ اس نے ہمیں کیوں پیدا کیا۔ قرآن مجید میں ہے (ترجمہ) ''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں'' ۔(الذّٰریٰت:۵۶) مگر ہم یہ عبادت کیسے کریں؟ وہ کونسے اعمال ہونگے جو اللہ کی نظر میں اس کی عبادت ہیں۔ یہی جاننے کے لئے ہمیں اس کی نازل کردہ کتاب کو پڑھنا، سمجھنا اور پھر عمل کرنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی مشین کا مینوئل اس کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ اس مشین کو استعمال کرنے والا اس کے بارے میں اچھی طرح جان لے اور اس سے بہترین فائدہ اٹھائے۔ انسان کی رہنمائی کے لئے اس کے خالق نے قرآن بھیجا ہے اور اس میں اس کے ہر رول خواہ وہ ماں باپ کا ہو یا اولاد کا، مالک وغلام، حاکم و رعایا استاد یا پھر شاگرد کا ہو۔ ہر ایک کی ذمہ داریوں اور حقوق کو بڑے واضح اور آسان الفاظ میں سکھایا ہے تاکہ غلطی کی گنجائش ہی نہ رہے۔ لیکن اگر انسان اپنے مینوئل کو پڑھے ہی نہیں یا اس میں درج ہدایات سے استفادہ نہ کرے اور اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرنے میں زندگی بسر کردے تو کیا وہ آخرت میں کامیاب ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ آخرت کی کامیابی کی کنجی تو اس قرآن کو پڑھ کر اس کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے۔ تو آیئے آج سے یہ تہیہ کرتے ہیں کہ قرآن کو صرف پڑھیں گے ہی نہی بلکہ سمجھ کر پڑھیں گے اور اس پر عمل کر کے اس دنیا اور آخرت کی کامیابی سمیٹیں گے۔

☆☆☆

ہمارے معاشرتی رویے

قومی غیرت

(اسرار احمد کسانہ)

ایک دوست نے مجھے ای میل فارورڈ کی ہے سوچا کہ آپ سے شیئر کروں۔ جرمنی کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ جرمنی ایک صنعتی ملک ہے جہاں دنیا کی بہتری مصنوعات اور بڑے بڑے برانڈز مثلاً مرسڈیز، بی ایم ڈبلیو اور سیمنز پرڈکٹس بنتے ہیں۔ ایٹمی ری ایکٹر میں استعمال ہونے والے پمپ تو اس ملک کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بنتے ہیں۔ اس طرح کے ترقی یافتہ ملک کے بارے میں یہ اندازہ مشکل نہیں کہ وہاں لوگ کس طرح عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہوں گے۔ میں جب پہلی بار اپنی تعلیم کے سلسلے میں جرمنی کے شہر ہمبرگ پہنچا تو وہاں پر موجود میرے دوست مجھے استقبال کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ جس وقت ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو وہاں اکثر میزیں خالی تھیں صرف ہمارے قریب میں ایک میز پر نوجوان میاں بیوی کھانا کھانے میں مشغول تھے، ان کے سامنے صرف ایک ڈش میں کھانا رکھا ہوا تھا جس کو وہ اپنی اپنی پلیٹ میں ڈال کر کھا رہے تھے۔ دونوں کے سامنے ایک ایک گلاس بھی رکھا جس میں شاید جوس تھا، جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان میاں بیوی کا رومانٹک ماحول میں بیٹھ کر کھانا کھانے کو جی تو چاہ رہا ہوگا مگر جیب اجازت نہ دیتی ہوگی، ان کے علاوہ ریسٹورنٹ میں چند ایک عمر رسیدہ خواتین بھی نظر آ رہی تھیں۔ ہم سب کی بھوک اپنے عروج پر تھی اسی لئے ہم نے فراخدلی سے آرڈر لکھوایا اور رش نہ ہونے کے باعث جلد ہی کھانا تیار ہوگیا اور ہم نے بھی کھانا کھانے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔ پیسے ادا کر کے ہم جب جانے کے لئے اٹھے تو ہماری پلیٹوں میں کم از کم ایک تہائی کھانا ابھی بچا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر ان بوڑھی عورتوں نے ہمیں آوازیں دینا شروع کر دیں۔ مڑ کر دیکھا تو وہ ایک جگہ جمع ہو کر زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہمیں محسوس ہوا کہ یہ خواتین ہمارا کھانا چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ کر سیخ پا ہو رہی تھیں۔

ایک دوست نے صورتحال واضح کرتے ہوئے کہا ہم نے سارے کھانے کے پیسے ادا کر دیئے ہیں اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ بات سنتے ہی ایک عورت ٹیلی فون کی طرف بڑھی اور کسی کو وہاں فوری طور پر پہنچنے کو کہا۔ اس صورتحال میں ہمارا وہاں سے بھاگ جانا مزید مسائل کھڑے کرسکتا تھا اس لیے ہم نے بادل نخواستہ وہیں کھڑے رہنا مناسب سمجھا۔ چند ہی ساعتوں میں ایک باوردی شخص وہاں آیا جس نے ہمیں بتایا کہ وہ سوشل سکیورٹی کے محکمہ سے تعلق رکھتا ہے، صورتحال کو جانچ کر اس نے ہم پر پچاس مارک کا جرمانہ عائد کر دیا جو میرے دوست نے ادا کر دیا اور معذرت بھی کی۔ اس نے رسید بنا کر میرے دوست کے ہاتھ میں تھمادی اور سخت لہجے میں کہا کہ آئندہ سے جب بھی کھانا طلب کرو تو تنا ہی منگواؤ جتنا تم کھا سکتے ہو، تمہارے پیسے تمہاری ملکیت ضرور ہیں مگر وسائل معاشرے کی امانت ہیں۔ اس دنیا میں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو غذائی کمی کا شکار ہیں تمہیں کوئی حق نہیں کہ تم کھانے پینے کی اشیاء کو اس طرح ضائع کرو۔ شرم سے ہمارے چہرے سرخ ہو رہے تھے مگر ہمارے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر میرے دوست نے سامنے کی دکان سے جرمانے کی رسید کی فوٹو کاپیاں بنوا کر ہم سب کو یادگار کے طور پر دیں تاکہ ہم گھروں میں انہیں نمایاں جگہ پر آویزاں کر کے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہم کبھی ایسا اسراف نہیں کریں گے اور یہ بھی کہ ہمارا مال یقیناً ہماری ملکیت ہے مگر وسائل ہمارے معاشرے کے لئے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم انتہائی اسراف کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی مہمان آجائے تو ہم اپنی حیثیت سے بڑھ کر اتنا کھانا پکاتے ہیں جس میں زیادہ حصہ نہ صرف بچ جاتا ہے اور فریج کی نظر ہو جاتا ہے بلکہ بالآخر ضائع بھی ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عالم یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں بھوک بھنگڑے ڈال رہی ہے اور صرف گزشتہ سات سالوں میں ایسے لوگوں کی تعداد 38فیصد سے 49 فیصد ہوگئی ہے جنہیں خوراک کے لئے کسی ڈونر ایجنسی یا ادارے کی مدد کی ضرورت ہوئی ہے۔ 36 فیصد سے زائد ایسے لوگ ہیں جو خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور ان میں سے آدھے ایسے ہیں جو ناخواندہ بھی ہیں۔ بھوک یا خوراک کا کم ہونا صرف پاکستان کا ہی نہیں بلکہ

ساری دنیا بشمول امریکہ کا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ افریقہ کے متعدد ممالک ہی نہیں بلکہ امریکہ میں بھی بھوکے لوگوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سے ملتا جلتا حال یورپ اور دیگر کا ہے۔ اگر آج ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس صورتحال سے یہ سبق لے لیں کہ کم ازکم ہم خوراک کو ضائع نہیں کریں گے اور اپنے دسترخوان پر صرف اتنی خوراک رکھیں جتنی ہمیں بھوک ہوگی تو شاید ہم دنیا میں بھوکے افراد کی تعداد میں کمی لانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

(نوائے وقت۔ 4-11-11)

خودکش بمباروں سے بھی خطرناک مخلوق

(جمشید چشتی)

ایک خبر نظر سے گزری کہ گلشن روای کے ایک شادی ہال میں زہریلا کھانا کھانے سے دوسو افراد کی حالت نازک ہوگئی۔ متذکرہ شخص نے شادی ہال کے مالکان، ہمایوں اور میاں سہیل وغیرہ کے خلاف تھانے میں زہریلا کھانا کھلانے پر مقدمہ درج کروایا۔

ایسی بہت سی خبریں اکثر و پیشتر اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں لیکن ملزمان پولیس کی ملی بھگت سے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر سے اپنے غیرذمہ دارنہ بلکہ مہلک کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اصل میں ہمارے یہاں بوسیدہ کھانا فروخت کرنا اور کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا ایک رواج بن گیا ہے۔ اگر پولیس اور قانو نافذ کرنے والے ادارے نیک نیتی سے ملزمان کو سزا دلوانے کی ٹھان لیں تو اس قسم کے واقعات کی روک تھام ہوسکتی ہے۔ ہمارے ایک بزرگ شاعر ہیں جن کا بیٹا اسی طرح کسی ہوٹل سے غیرمعیاری کھانا کر گھر پہنچا اور بالآخر اللہ کو پیارا ہوگیا۔ وہ بزرگ آدمی کسی کے خلاف مقدمہ بھی درج نہ کروا سکے کیونکہ اس انہیں معلوم ہی نہیں کہ بیٹے نے کھانا کہاں سے کھایا تھا۔ ایسے موت کے سوداگروں کو سزائے موت ہونی چاہیے کیونکہ مغربی ممالک میں کھانے کی اشیاء میں ملاوٹ کرنے اور غیرمعیاری کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنے والے کو سزائے موت ہی دی جاتی ہے۔ لوگوں کی زندگی سے کھیلنے والے ان قاتلوں کو پوچھنے والا اور سزا دینے والا ہمارے ہاں کوئی نہیں؟ حکومت کہاں ہے؟ حفظان صحت کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے والے ادارے کہاں ہیں؟ محکمہ صحت کے وزیر، مشیر اور سیکرٹری حضرات کیا کر رہے

ہیں؟ کہتے ہیں سوئے ہوئے کو جگانا آسان ہے لیکن جاگے ہوئے کو (سونے کا ڈرامہ کر رہا ہو) کون جگائے؟

میں جب انگلینڈ گیا تو وہاں ایک پاکستانی کے بارے میں سنا۔ ایک انگریز خاتون ڈیری کا کاروبار کرتی تھی۔ اسے مارکیٹ میں دودھ سپلائی کرنے کے لئے ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا۔ ہمارا پاکستانی بھائی بیکار تھا اور نوکری کی تلاش میں تھا۔ وہ چلا گیا۔ قصہ مختصر اسے نوکری مل گئی۔ خاتون کا کاروبار چونکہ محدود تھا اور اس کے پاس جتنی گائے، بھینسیں تھیں ان کے دودھ سے جو رقم حاصل ہوتی تھی اور اسے معلوم تھی کیونکہ وہاں ہماری طرح آئے روز قیمتیں بڑھتی نہیں رہتیں۔ دو تین ہفتے بعد ہمارے پاکستانی بھائی کے دل میں خاتون کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ابھر آئے۔ اس نے سوچا ہماری مالکن کی آمدن کم ہے اسے بڑھانا چاہیے۔ اس نے بغیر خاتون کو بتائے دودھ میں پانی ملانا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے پانی ملانے سے دودھ کی مقدار بڑھ گئی۔ مقدار بڑھنے سے آمدن بھی بڑھ گئی۔ جب خاتون کی آمدن بڑھی تو بڑی حیران ہوئی اور کسی حد تک خوش بھی۔ اس نے پاکستانی سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ گائے بھینسیں تو اتنی کی اتنی ہی ہیں، کیا انہوں نے دودھ زیادہ دینا شروع کر دیا ہے یا مارکیٹ میں دودھ کی قیمت بڑھ گئی ہے؟ ہمارے بھائی نے جواب دیا۔ نہیں میڈم! ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں نے دودھ میں تھوڑا سا پانی ملانا شروع کر دیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ اس انگریز عورت نے اسے گالیاں دینا شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگی، تمہیں علم ہے کہ تمہیں ملاوٹ کے جرم میں سزائے موت دلوا سکتی ہوں۔ تم میری قوم کو دھوکہ دے رہے ہو؟ پانی ملانے سے دودھ کی توانائی کم ہو جاتی ہے اور یہ دودھ بچے بوڑھے سبھی پیتے ہیں تم میری قوم کو کمزور کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتی ہوں لیکن تمہارے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔ اور اس عورت نے کھڑے کھڑے ہمارے پاکستانی بھائی کو نوکری سے نکال دیا۔

یہ فرق ہے ان ایماندار کافروں میں اور ہم بے ایمان مسلمانوں میں۔ وہ اپنی قوم کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہم صرف اور صرف اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی جان بھی لینے سے گریز نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ

ہمارے یہاں تو ادویات میں بھی ملاوٹ کی جاتی ہے۔

(نوائے

وقت 08-4-17)

☆☆☆